

نگار

مجلہ علمی و ادبیہ

رئیس التحریر

نیاز فختوری

مجلہ نگار کے دو شعبے

۱۔ شعبہ ترتیب:- اس شعبہ سے جو مراسلت کیجائے (جس میں رسائل اخبارات کا تبادلہ، ترسیل مضامین اور تمام وہ مکتوبات شامل ہیں، جن کا تعلق ادبی ہے) اس میں براہ کرم یہ پتہ تحریر فرمائیے۔

حضرت نیاں فتحپوری بھوپال

۲۔ شعبہ نشر و نظام:- اس شعبہ سے جو خطاب کیا جائیگا جس میں ترسیل زر، درخواست خریداری، مضامین، اشتہار وغیرہ شامل ہیں) اس کا پتہ یہ ہوگا۔

مینجر نگار من ٹولہ گڑھ

لطیف الدین احمد

زین شرکت (ڈائریکٹر کمپنی)

اجرت نامہ اشتہار سالہ نگار

تعداد طبع	ایک صفحہ	نصف صفحہ	ربع صفحہ
۱۲	۵۶۰	۵۴۰	۵۲۰
۹	۵۳۰	۵۱۰	۴۹۰
۶	۵۰۰	۴۸۰	۴۶۰
۳	۴۷۰	۴۵۰	۴۳۰
۱	۴۴۰	۴۲۰	۴۰۰

پیشگی اجرت اشتہار ہیجائیگی معاہدہ اشتہار منسوخ نہیں ہو سکتا مدت معینہ کے اندر مضمون اشتہار بدل سکتا ہے کسی اشتہار کا جو منظر نہیں کیا جائیگا فائیل کے اشتہارات کی اجرت نرخ نامہ سے ۲۵ فیصدی زائد ہوگی۔

نگار

- (۱) ہر انگریزی مہینہ کے تیسرے ہفتے میں شائع ہو جائیگا، اسلئے اگر سب تک نہ پہنچے، تو ہمیں مطلع فرمائیے۔
- (۲) چونکہ ایک مشترکہ سرمایہ سے جاری ہوتا ہے، اسلئے مالی مشکلات کی وجہ سے اس کے بند ہونیکا خیال دل میں نہ لائیے۔
- (۳) پانچ روپے میں ایک سال تک، تین روپے میں چھ ماہ تک آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا رہیگا۔ اس سے کم مدت کیلئے درخواست خریداری آپ کی شان کے منافی ہے، اسلئے ہم بھی اس کی تعمیل سے احتراز کریں گے۔
- (۴) پیشگی قیمت روانہ کرنیکا مشورہ آپ کو دینا ہے، کیونکہ وہی پی پی میں آپکا نقصان ہے، جو ہمیں کسی طرح گوارا نہیں ہو سکتا، البتہ اگر آپ چاہیں تو ہر ماہ ۸ آنے کے ٹکٹ بھیج کر رسالہ حاصل کر سکتے ہیں۔

(مینجر نگار - اگرہ)

نگار

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

مجلد ۱
شمار ۳
شعبان ۱۳۴۲ھ اپریل ۱۹۲۲ء
قیمت سالانہ پانچ روپیہ ششماہی تین روپیہ
قیمت فی پرچہ آٹھ آنے

فہرست

۵۸	نیاز	۲	مسئلہ نور	نیاز	ملاحظات
۶۲	نیاز	۳	محبت کی دیوی	نیاز	فرانس کی اعظم پستی
۷۰	لطیف الدین احمد	۹	دو صنائع	محمد صادق علی خاں نظر	غزل
۷۰	حضرت فانی بی۔ اے (علیگ)	۱۰	غزل	قمر	عجم کے کارنامے
۷۱	نیاز	۲۱	حکومت اسلام اور سنسکرت	نیاز	ڈراما اور رومان
۷۳	نیاز	۲۹	غزل	نیاز	غزل فارسی
۷۴	نیاز	۳۰	معلومات	لطیف الدین احمد	لالہ رخ
۸۰	نیاز	۵۶	یاران نجد	حضرت مسہار علیگ	غزل
		۵۷		حضرت ناصر	مزار (نظم)

ملاحظات

۱۔ ملک میں جس شوق کے ساتھ نگار کی پذیرائی کی گئی وہ بہت امید افزا ہے اور باب ذوق نے جس لطف سے کام لیا اپنی قیمتی رائیں ظاہر کیں وہ ہمارے لئے بہت مستحق ہے۔
۲۔ اس وقت تک جتنے مضامین موصول ہوئے اور ستر دہائی گئے انہیں اکثر حصہ ادبی مضامین کا تھا اور وہ بھی گور کے رنگ کا۔ اسلئے میں ہمیشہ کیلئے یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ اس رنگ کا کوئی ادبی مضمون شائع نہیں ہو سکتا، جب تک کہ اس کوئی خاص ندرت نہ پیدا کی جائے مختصر افسانے نہایت شکر یہ کے ساتھ قبول کئے جائیں گے۔
اگر اس موضوع کے تمام خصوصیات کو پیش نظر رکھ کر لکھے گئے۔

۳۔ دوسری اشاعت میں ایک مضمون آرزو کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ افسوس ہے کہ مسودات میں مخلوط ہو جانے کی وجہ سے وہ مضمون لکھ گیا اور رسالہ طبع ہو جانے کے بعد اس کا پتہ چلا۔ پہلی اشاعت میں نظم اندر پرستش "مستر براؤن کی کتاب سے لی گئی تھی۔

۴۔ نگار میں باوجود اعلان اس وقت تک کوئی تصویر شائع نہیں ہوئی جس کا سبب صرف یہ ہے کہ پہلی تصویر کا بلاک ناقص بنا تھا اور بعد کو جو تصاویر فراہم کی گئیں ان کے بلاک ہنوز طیار ہو کر نہیں آئے۔ چوتھی اشاعت سے اک نہایت دلچسپ سلسلہ مضامین علم ہدایت کے متعلق شروع کیا جائیگا اور پانچویں نمبر میں تین تصاویر اس مخصوص فن کے متعلق شائع کی جائیں گی، جو گذشتہ فرد گزشتہ کی تلافی کر سکیں گی۔

۵۔ روزنامہ سیاست نے حال ہی میں نگار کا ایک مضمون "مغرب میں اخبار کی نو مکر مرتب ہوتا ہے" نقل کیا ہے لیکن نگار کا حوالہ نہیں دیا۔ اور

حریم

نسوانی ذوق کو پورا کرنے والا واحد علمی و ادبی رسالہ

نظام تمدن کا وہ اہم ترین پہلو، جو سب سے پہلے عالم انسانی کی توجہ اپنی طرف جذب کر سکتا ہے، اس جنس سے متعلق ہے، جسے ہم لطیف، نازک اور سرلیعہ التاثر کہتے ہیں لیکن اس کا علاج کہ فردیت کی شدت کے ساتھ ہمارے احساس میں کوئی تغیر پیدا نہیں ہوتا، دراصل ایک جوہر سب سے زیادہ نازک ہو اسی کی حفاظت زیادہ ضروری ہوتی ہے۔ افسوس ہے کہ اس وقت کوئی ایسا رسالہ اردو میں موجود نہیں ہے جو صنف نازک کی ضروریات و جذبات کے لحاظ سے انکا بہترین شہر ثابت ہو اور ان کے لئے بہترین علمی و ادبی سربراہ ہو۔ دارالاشاعت نگار نے اس فقدان کو محسوس کر کے آخر کا یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ آئندہ جولائی سے ایک نسوانی رسالہ بھی حریم کے نام سے شائع کیا جائے جو اپنی طباعت کتابت، مضامین و مطالب حسن صورتی و معنوی کے لحاظ سے خواتین کا بہترین رفیق ثابت ہو۔

کوشش کی جائیگی کہ ہمیں نسوانی زندگی کے تمام عجیبہ و اہم ضروریات پر بہترین معلومات و مضامین شائع کیے جائیں جنہیں دیگر مرد جان سکیں کہ عورتیں کس تربیت کی مستحق ہیں اور عورتیں یہ سمجھ سکیں کہ فطرت نے انہیں کس مقصد کیلئے پیدا کیا ہے اور ملک و قوم کا مستقبل ان سے کس چیز کا طلب گار ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اس تحریک کا خیر مقدم نہایت امید افزا طریق پر کیا جائیگا اور اس سے ہمیں بخیر نہ رکھا جائیگا۔

مینجر نگار

فرانس کی عاظم پرستی

ملی حمیت و خودداری کا اک عجیب و غریب کا رنامہ

نپولین کی حیات بعد المات

(۱)

نپولین اعظم کے آخری ایام حیات جس عالم بیکسی میں بسر ہوئے، وہ تاریخ فرانس کا نہایت دروند واقعہ ہے، لیکن جبوقت اس حقیقت پر غور کیا جاتا ہے کہ اس واقعہ سے قبل، سبزرہین فرانس کیلئے نپولین نے کیا کیا قربانیاں کیں، کن کن اداؤں سے اس نے اپنے وطن پرستی کا ثبوت دیا اور ملک قوم کی محبت میں اس نے کس طرح اپنے آپ کو فنا کر دیا، تو اس واقعہ کی دردمندی اک نشان ہدایت ہو کر رہ جاتی ہے، جس کے عوض میں ایک شخص کیلئے جان دیدینا بھی حد درجہ آسان ہو جاتا ہے اور اس تکلیف کے تبادلہ میں ایک قوم کے لئے، اپنی بہترین راحتوں سے دست بردار ہو جانا بھی نہایت ازرانہ سودا قرار پاتا ہے۔

نپولین نے فرانس کیلئے کیا کیا، فرانس کی ترقیاں کس حد تک اس کی ممنون ہیں۔ یہ تاریخ عالم کے وہ غیر فانی نقوش ہیں، جنہیں زمانہ کبھی فراموش نہیں کر سکتا، اور جو ہمیشہ مجالس رزم و بزم میں دہرائے جائیں گے، لیکن وہ لوگ جنہوں نے نپولین کو صرف ایک فاتح قاید اعظم کی حیثیت سے دیکھا ہے، انھیں یہ صداقت بھی ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ نپولین کو جو تعلق فرانس سے تھا، اسکی بنیاد ملوکانہ عزائم پر قائم نہ ہوئی تھی، بلکہ اس شدید جذبہ محبت پر اسے تیار ہوئی تھی، جسے اب فدویت و فداکاری سے تعبیر کرتے ہیں۔

پھر جس طرح نپولین کو اپنے ملک کے ساتھ عشق تھا، اسی طرح اہل فرانس میں بھی اُسکے لئے حد درجہ عقیدہ مند شغف پایا جاتا تھا، اور یہی وہ رابطہ باہمی ہے، جس سے ایک قوم کا مستقبل روشن ہوتا ہے اور یہی وہ اعظم پرستی ہے، جس سے ایک ملک کی زندگی وابستہ ہے۔

جب ۱۸۲۱ء میں نپولین ایک دور افتادہ جزیرہ ہیلینا کے اندر اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہا تھا، تو صرف یہ خیال اُسکے لئے تکلیف دہ تھا کہ وہ فرانس سے باہر دم توڑ رہا ہے اور اسکی نگاہیں اس فضا میں تحلیل ہو رہی ہے، جو اسکے وطن و ارباب وطن سے بہت دور ہے۔
لوگوں کو خیال تھا کہ جبوت نپولین کا وصیت نامہ پڑھا جائیگا تو اس میں خدا جانے کیا خواہشیں لکھی گئی ہوں گی، لیکن وہ بھی کیسا دلگداز منظر تھا جب اسکی آخری تمنا کے بابت سوال کیا گیا اور اُس نے سوائے اُسکے اور کچھ نہیں کہا کہ :-

”میری ہڈیاں جزیرہ ہیلینا سے منتقل کر کے دریائے سین کے ساحل پر دفن کی جائیں تاکہ میں اپنی قوم والوں کے ساتھ پرسکون گہری نیند سوتا رہوں۔“

افسوس ہے کہ اس عہد کے مسائل سیاسیہ نے اس وصیت کی تکمیل کو تعویق میں ڈال دیا اور کال انیس سال تک نپولین کی لاش اسی غیر آباد جزیرہ میں مدفون رہی۔ ہر چند وفات نپولین کے تین ماہ بعد ہی حکومت فرانس سے درخواست کی گئی کہ اس وصیت کو پورا کیا جائے اور اسکے بعد ہی ۱۸۳۰ء، ۱۸۳۲ء اور ۱۸۳۶ء میں مسلسل طور پر کوشش کی گئی کہ نپولین کی ہڈیاں جزیرہ ہیلینا سے منتقل کر دی جائیں، لیکن اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔

اس طویل عرصہ میں نپولین کی شہرت بڑھتی جاتی تھی، جھوٹری میں رہنے والے سے لیکر محلات میں آرام کرنے والے تک اسکے غیر فانی کارناموں سے دلچسپی لینے لگے تھے اور اسکی عظمت و جلالت ہمہ تن استقبال کے واقعات سارے ملک میں مشہور ہو چلے تھے۔ چنانچہ فرانس کے مشہور شاعر و کٹر کے قلم سے بھی یہ الفاظ نکل گئے کہ :-

”تیرے سارے عزت سے عنقریب بدلیاں دور ہونے والی ہیں اور وہ وقت دور نہیں جب

میری صداقت اور روشن شما میں ہم تک آزادی سے آسکیں گی۔“

لیکن ابھی وہ وقت نہیں آیا تھا اور تکمیل وصیت کی ساعت کسی اور موقع کی منتظر تھی۔

نپولین کے بعد عالم سیاست میں فرانس کی وہ عزت و وقعت باقی نہیں رہی تھی، جو اسکی زندگی میں پائی جاتی تھی، لیکن یہ بھی فطرت کا کس قدر عجیب و غریب طریقہ کار ہے کہ یہی وہ انحطاط تھا جسے پھر ایک بار اہل فرانس میں نئی روح پھونک دی اور پھر نپولین کی محبت اُنکے قلوب میں موجزن کر کے دکھا دی۔ نپولین کے بعد جس قدر زمانہ گزرتا جاتا تھا، فرزند ان فرانس کے جوش ملی میں بھی ترقی ہوتی جاتی تھی حتیٰ کہ جب اسکی ہڈیاں جزیرہ ہیلینا سے ساحل سین پر منتقل کی گئیں، تو فرانس کے حیات قومی کا جمود یکسر اضطراب بنگیا اور یورپ کے طول و عرض میں یہ صدا گونج اٹھی کہ :-

”نپولین مرنے کے بعد اپنی قوم کو زندہ کرنے آ رہا ہے“

اور جرمنی کا مشہور شاعر ہنری ہینی یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ ”نپولین کی لاش جزیرہ ہیلینا سے ہماری طرف نہایت باقاعدہ قدم اٹھاتی ہوئی بڑھ رہی ہے، گویا وہ اپنی تہدید آمیز رفتار سے ہمارے مستقبل کو دھمکی دے رہی ہے“

(۲)

جس زمانہ میں نپولین کی وصیت پوری ہو گئی، وہ ایسا زمانہ تھا جب حکومت اور قوم کے تعلقات بہت کشیدہ ہو گئے تھے، اور فرانس کی اک بڑی جماعت ”نپولین پرست“ ہو گئی تھی۔ چونکہ قوم کے جذبات بڑھی حد تک ناقابل ضبط ہو گئے تھے اور سلطنت کے ارباب حل و عقد نے فرانس کی داخلی و خارجی سیاست سنبھالنے کیلئے اس سے بہتر کوئی اور ذریعہ نہیں دیکھا کہ رعایا کی متفقہ اسناد عار کو قبول کیا جائے، اسلئے نپولین کی وہ وصیت جو زمانہ دراز سے التواء میں پڑی ہوئی تھی اور جس کی تکمیل کے لئے اہل فرانس اصرار کر رہے تھے، پوری کی گئی اور ملک کے جذبات بڑھی حد تک ٹھنڈے ہو گئے۔

جب پہلی مئی ۱۸۴۰ء کی صبح کو، جو شاہ فرانس کے ”عید جلوس“ کی صبح تھی، تمام ذرا وارا کین شاہی محل میں رسم تہنیت ادا کرنے حاضر ہوئے، تو لوئی فلپ شاہ فرانس نے صدر اعظم سیرس کو مخاطب کر کے کہا کہ :-

”میں اس عید کو خوشی میں آپ لوگوں کے لئے ایک ہدیہ پیش کرنا چاہتا ہوں اور وہ ہدیہ، یہ ہے کہ نپولین کی لاش اسکے محبوب وطن میں لا کر دفن کی جائے۔ میں پرس جو انفیل کو اس غرض کے لئے جزیرہ ہیلینا بھیجنا چاہتا ہوں اور تمہیں اجازت دیتا ہوں کہ اس باب میں وزارت برطانیہ سے مراسلت شروع کر دیا جائے“

اس زمانہ میں موسیو گینزو، فرانس کی طرف سے لندن میں عہدہ سفارت پر مامور تھا۔ چنانچہ اس نے برطانیہ کے وزیراعظم سے اس مسئلہ کو طے کر کے فرانس کو اطلاع دی اور ۱۲ مئی ۱۸۴۲ء کو فرانس کی مجلس وزارت نے اس خبر کا اعلان کر دیا کہ "نپولین کی لاش جزیرہ ہیلینا سے فرانس میں منتقل کی جائے گی۔" ظاہر ہے کہ اس خبر سے اہل فرانس کو کس قدر مسرت ہوئی ہوگی۔ کوئی گھر ایسا نہ تھا جہاں اس اعلان نے شگفتگی و تازگی نہ پیدا کر دی ہو اور کوئی قلب ایسا نہ تھا جو حماست و شجاعت، اور فرانس کی گذشتہ سطوت و جبروت کے خیال سے معمور نہ ہو۔ مجالس تہنیت قائم کی گئیں، محافل طرب برپا ہوئیں اور زندگی کی ایک نئی لہر درہ درہ میں دوڑ گئی۔

جب تمام مبادیات طے ہو گئے، تو وزارت فرانس نے مصارف کا تخمینہ کیا اور ایک ملین فرانک کی منظوری دی، لیکن جمعیت انتظامی نے، جو اس مقصد کے لئے قائم کی گئی تھی، اس رقم کو ناکافی قرار دیکر ایک ملین فرانک کا اور مطالبہ کیا۔ چونکہ حکومت اس مطالبہ کو پورا نہ کر سکتی تھی، اس لئے چند وکیلے اشتہار دیئے گئے اور لوگوں نے نہایت خوشی سے اس میں حصہ لیا۔ متبعین نپولین نے تو اپنا اثاثہ البیت تک فروخت کر دیا اور اس مطالبہ کو پورا کرنے کیلئے کوئی دقیقہ کو شش کا نہ اٹھا رکھا۔

اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ نپولین کی یادگار کہاں قائم کی جائے۔ بعض نے کنسیہ ماڈلین تجویز کیا، بعض نے بنٹیوں کی راے دی۔ ایک جماعت نے منارہ فنڈوم کو مناسب سمجھا اور دوسری نے میدان کوئگورڈ کو۔ آخر کار سب اس پر متفق ہو گئے کہ نپولین کی لاش قصر انفالید میں دفن کی جائے، جہاں فرانس کے بہت سے مفاخر حربی رہے۔ *Monument* پائے جاتے ہیں۔

اس غرض کے لئے جو جماعت مرتب کی گئی تھی اس میں نپولین کے وہ رفقا بھی شامل تھے، جو اس وقت تک زندہ موجود تھے اور ان کا صدر، پرنس جوائفیل کو قرار دیا گیا۔

۷ جولائی ۱۸۴۲ء کو شام کے سات بجے، یہ جماعت بل پول جہاز پر، جو فرانس کا بہترین جنگی جہاز تھا، بندرگاہ تولون سے ہیلینا کی طرف روانہ ہوئی۔

اس سفر کو مسلسل تین ماہ کا عرصہ گزر چکا تھا کہ ۷ اکتوبر کو دور سے خشکی کا حصہ نظر آیا اور ۹ اکتوبر کو ۱۱ بجے، پرنس جوائفیل اپنے ہمراہیوں کے ساتھ خشکی پر اترا۔ یہ جماعت سب سے پہلے حاکم جزیرہ کے مکان پر گئی، یہاں انہیں وہ کچھوے دکھائے گئے جو نپولین کے زمانہ سے زندہ چلے آ رہے تھے۔ اسکے

بعد نپولین کی قبر کی زیارت کی اور پھر اس مکان کو دیکھا، جہاں وہ مجبوس تھا۔ اس مکان کی دیواروں پر سیکڑوں عبارتیں لکھی ہوئی تھیں، جن سے زائرین کے جذبات ظاہر ہوتے تھے۔ ذیل کی ایک عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ نپولین کے ساتھ لوگوں کو کس قدر محبت تھی اور اسکی یاد میں لوگ کس درجہ مضطرب تھے:-

میشل روپرو نے جو پہلے پولیس کا سپاہی تھا، صرف اسلئے جہاز اٹالیا کی ملازمت اختیار کی کہ وہ اپنے کا بورل صغیر (Small Boat) کے مکان کی زیارت کر سکے۔ الوداع!

۱۴ اکتوبر تک یہ جماعت طیاری میں مصروف رہی اور اس تاریخ کی رات کو اپنے محبوب بادشاہ کی لاش نکالنے روانہ ہوئی۔ آدھی رات کو یہ لوگ اس باغ میں داخل ہوئے، جہاں نپولین مدفون تھا اور صبح کے وقت پچاس آدمیوں نے اس پتھر کو مٹایا جو قبر پر رکھا ہوا تھا۔ ۹ بجے صبح کو سب لوگ تابوت دیکھنے آئے جس کے چار حصہ تھے، پہلا لکڑی کا، دوسرا سیسے کا، تیسرا پھر لکڑی کا اور چوتھا جست کا۔

جب تابوت کھولا گیا، تو سب نے دیکھا کہ جسم کے اوپر بڑی مقدار میں روئی رکھی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر نے جو جمعیت کے ساتھ تھا، پانوں کی طرف سے روئی لپٹنی شروع کی اور تھوڑی دیر بعد حاضرین پر یکایک خوف کے آثار نمودار ہو گئے، کیونکہ انہوں نے دیکھا کہ جسم حرکت کر رہا ہے، لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ یہ حرکت جسم کی نہیں ہے بلکہ ان بیش قیمت کپڑوں کی ہے، جن میں نپولین کا جسم ملفوف ہے۔

جب پورا جسم ظاہر ہوا، تو لوگوں نے دیکھا کہ اس طویل مدت نے اسکے جسم میں کوئی غیر معمولی تغیر پیدا نہیں کیا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نپولین سو رہا ہے۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے اس منظر کو اس طرح بیان کیا ہے:-

”نپولین کے نقوش میں کوئی قابل ذکر تغیر واقع نہیں ہوا تھا، سوائے اسکے کہ ناک کے نیچے کا حصہ کچھ بگڑ گیا تھا اور خساروں میں کچھ فرق پیدا ہو گیا تھا جس سے اسکے گندمی رنگ میں زیادہ سیاہی نمودار ہو گئی تھی۔ سر منڈا ہوا تھا، آنکھیں بند تھیں، ہونٹوں کی کیفیت تبسم طاری تھی، سینہ بہت سے تمغے تھے اور دونوں پاؤں کے درمیان دو ظرف رکھے ہوئے تھے جن میں سے ایک میں اسکا دل رکھا ہوا تھا اور دوسرے میں اسکا معدہ۔“

جب سب لوگ اس موثر منظر کو دیکھ چکے، تو تابوت بند کیا گیا اور ۴۳ آدمیوں کی مدد سے اُسے گاڑی پر رکھ کر جہاز کی طرف لے گئے۔ جب لاش جہاز پر پہنچی تو تین سو ضرب توپ سلامی میں سر کی گئیں۔

۱۸ اکتوبر کو جہاز بل پول نے لنگر اٹھایا۔ دو فرانسیسی جہاز اور اسکے جلو میں تھے۔ راستہ میں کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا، سوائے اسکے کہ مسافر یہ خبر سن کر بہت پریشان ہوئے کہ فرانس کی سیاسی حالت بہت نازک ہو گئی ہے اور وہ بھی دیگر دولِ یورپ کے ساتھ مسئلہ شرقیہ کے سلسلہ میں شریک جنگ ہونے پر مجبور ہے۔

۲۹ نومبر کو جہاز، بندرگاہ چر برگ میں لنگر زن ہوا اور کال آٹھ دن اسے انتظار کرنا پڑا، کیونکہ جلوس کی تیاریاں، اس وقت تک مکمل نہ ہوئی تھیں۔ آٹھ دن کے بعد، لاش بل پول سے اتار کر، جہاز نارمنڈی میں رکھی گئی، جو اُسے لیکر پاور کی جانب روانہ ہوا (جو نہر سین کے دہانہ پر واقع ہے) پاور پہنچنے پر لاش ایک چوٹی کشتی پر رکھ کر نہر سین کے راستہ سے پیرس کی طرف روانہ کی گئی۔

جب ۱۲ دسمبر کو یہ لاش پیرس پہنچی، تو اس وقت سردی کا یہ عالم تھا کہ تھرمامیٹر، صفر سے ۱۴ درجے نیچے اتر آیا تھا، لیکن اہل فرانس کے ذوق و شوق کی یہ کیفیت تھی کہ آدھی رات سے انھوں نے اس مہمانِ عزیزی کی پذیرائی کی تیاریاں شروع کر دی تھیں اور طلوعِ آفتاب سے قبل سب لوگ قصرِ انفالید پر پہنچ گئے تھے۔

باجے بج رہے تھے، ترانے گائے جا رہے تھے، توپیں سرسورہی تھیں، کنائس کے گھنٹے شور کر رہے تھے، راستے ہجوم کیلئے تنگ ہو گئے تھے، کھڑکیوں اور دروازوں پر سیاہ پردے لٹک رہے تھے، اور سب لوگ نعرہ لگا رہے تھے:۔

”پولیٹین پائندہ باد، شہنشاہ زندہ باش“۔ لاش ایک گاڑی پر رکھی ہوئی تھی، جسے سولہ گھوڑے کہنچ رہے تھے اور تابوت کو ”معبودہ نصرت“ کے چودہ طلائی مجسمے اٹھائے ہوئے تھے۔

پردگراں میں لکھا تھا کہ وزیرِ امور و ممبرانِ بلدیہ کے بعد، جلوس میں ان فوجی لوگوں کی جماعت ہوگی، جو پولین کے ساتھ رہا کرتے تھے، لیکن ان لوگوں کے جوش کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے پردگراں کی مطلق پرواہ نہیں کی اور سب سے پہلے وہی لاش کے گرد ہو گئے۔

قصرِ انفالید کے میدان میں تماشائیوں کا اس قدر ہجوم تھا کہ شام کو بے شمار ٹوپیاں، رومال، کپل وغیرہ وہاں سے اٹھائے گئے۔

یہ ہیں وہ لمحات تاریخی جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حیات انسانی کیونکر خلعتِ دوام حاصل کر لیتی ہے اور قلبِ دماغ کا وہ کونسا تاثر ہے جو اس کے فکر و ادراک کو غیر فانی بنا جاتا ہے۔

یقیناً، نپولین کی لاش ساحلِ سین پر منتقل نہیں کی گئی، بلکہ اس ملکی غیرت و خود داری، اس ملی سطوت و جبروت کو محفوظ کر دیا گیا، جسے حیاتِ قومی کی پیش نبض سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

فرانس میں مشکل سے مہتیں کوئی ایسا آدمی ملیگا، جو قبرِ نپولین کے پاس سے گذرتا ہو اور قومی جوش سے اس کے خون میں حرارت نہ پیدا ہو جاتی ہو۔ ہندوستان میں لاکھوں ایسے نشانات ہیں، جو ہماری غیرت و خود داری کو حرکت میں لانے کے لئے اپنی موثر ترین مسامریاں پیش نظر کرتے رہتے ہیں، لیکن انہیں دیکھ کر ہمارا دل اور مجھ جاتا ہے۔

فرانس کا باشندہ، نپولین کی قبر کا ذکر جس پندار کے ساتھ کر سکتا ہے، اُسی غرور کے ساتھ ہم بھی تاجِ راکرے کا نام لے سکتے ہیں، لیکن فرق یہ ہے کہ وہ فخر اک صداقت ہے بر ملا، اور یہ پندار اک کذب ہے، لغو و دوراز کار!

نیاز

غزل

بیاختہ اک اُن میرے منہ سے نکلی گئی
گو یا میرے خیال کی دنیا بدل گئی
جب دل ٹھہر گیا تو طبیعت سنبھل گئی

ہنگام دیدل کی یہ حالت بدل گئی
دیکھا ہے جب اُنکو کچھ عالم ہی اور ہے
تہی میرے واسطے حرکتِ قلب کی مضر

مرزا محمد صادق علیخان نظر

عجم کے کارنامے

اسلام کے عہدِ زرین میں

اگر خالص مذہبی نقطہ نظر سے دیکھا جائے، تو کسی کو اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ حقیقی معنی میں اسلام کا عہدِ زرین تو وہی تھا جب تک بانی اسلام اس عالم آیتِ گل میں بقیدِ حیات رہا، لیکن اگر اس خیال سے قطع نظر کر کے، علوم و فنون کے ارتقار، مدنیت و حضارت کے عروج کو پیش نگاہ رکھا جائے، تو یہ حقیقت تسلیم کرنی پڑے گی کہ وہ زمانہ ۳۲ھ سے شروع ہوتا ہے جب عہدِ عباسیہ کا اولین فرمانروا خلیفہ رونما ہوا اور پوری ایک صدی کے بعد ۲۳۲ھ پر ختم ہو جاتا ہے جب قدرت نے عنانِ خلافت، متوکل (دسویں خلیفہ) کے سپرد کی۔

جن لوگوں نے تاریخ کا سرسری مطالعہ کیا ہے، وہ بھی اس سے واقف ہوں گے کہ خلافتِ عباسیہ کی بنیاد صرف ایرانی النسل لوگوں کی مدد سے قائم ہوئی اور انہیں کی اعانت و مشورت نے اس خاندان کی حکومت کو انتہائے عروج تک پہنچا دیا۔

اس میں شک نہیں کہ بنو اُمیہ نے نہایت اہتمام و شان کے ساتھ حکومت کی، فتوحات کا سلسلہ بہت وسیع ہو گیا، اور اسلام میں مادی دولت کا بھی کافی اضافہ ہوا، لیکن بنو اُمیہ کی حکومت خالص عربی النسل لوگوں کی حکومت تھی، اور چونکہ اعراب، فطرت کی طرف سے درشت و خشن طبیعت لیکر آئے تھے، اسلئے باوجود بنو اُمیہ کی وسعتِ فتوحات و ملک گیری کے ان کی طبائع میں وہ لچک پیدا نہیں ہوئی جو حضارت و تمدن کے لئے ضروری ہے اور جس سے یہ لوگ بالکل نا آشنا تھے۔

جب بنو عباس کی خلافت کے ساتھ ساتھ، ایرانی اثر نظامِ حکومت میں غالب ہونے لگا اور عربوں کا اقتدار کم ہونے لگا، تو تمام وہی خصوصیات جو کسی وقت اکاسرہ عجم کی حکومت میں پائی جاتی تھیں، آہستہ آہستہ ان میں بھی پیدا ہونے لگیں، علوم و فنون کی طرف توجہ، تمدن و معاشرت کے لوازم کی فراہمی، ظاہری شان و شوکت، معاشرت کی رفعت و پاکیزگی، مذہبی وسعت نظر،

یہ سب وہ باتیں تھیں جو اس زمانہ میں پیدا ہوئیں۔ آل برمک نے دربار خلافت میں جو اثر اپنا پیدا کر لیا تھا وہ حقیقتاً اک انتقام تھا جو عجم سرزمین عرب سے لے رہا تھا اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس کی آخری حد کیا ہوتی، اگر درمیان میں ترکوں کی جماعت اس اثر کو مٹا کر ہوا کا بیج ہی نہ بدلتی۔

ایرانیوں یا آل برمک کے اقتدار کا نمایاں اثر یہ ہوا کہ دربار خلافت، علمی جلووں سے معمور ہو گیا اور ایک گروہ ایسے علماء کا پیدا ہو گیا جو نقل و عقل کو مطابق کرنا چاہتا تھا اور جسے اب معتزلہ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، معتزلہ نے کیا کیا، کس حد تک انہوں نے اسلام کی خدمت ادا کی، اپنے اخلاق و اصول کے لحاظ سے یہ لوگ کیسے تھے، اسکے لئے ایک مستقل مضمون کی ضرورت ہے، یہاں مختصراً اتنا کہنا کافی ہے کہ اگر معتزلہ کا وجود نہ ہوتا، تو اسلام فطری مذہب ہونے کے لحاظ سے لوگوں کی نگاہوں سے گر گیا ہوتا اور اک الہامی دین کی حیثیت سے اسکو نہایت سخت آزار پہنچ جاتا، لیکن ترکوں کے عروج کے ساتھ ہی ایک طرف ایرانیوں کا اثر دربار خلافت سے کم ہو گیا اور دوسری طرف وہ مذہبی و علمی ترقی جو معتزلہ کی وجہ سے ہو رہی تھی دفعتاً رک گئی اور آہستہ آہستہ اس کی جگہ انہیں اصول نے لے لی، جو صرف اک مسلمان ہی کے سامنے پیش کئے جاسکتے ہیں اور جنہیں وہی شخص تسلیم کر سکتا ہے جو پہلے سے اسلام کا ماننے والا ہو۔

ہم یہ ابھی بیان کر چکے ہیں کہ خلافت عباسیہ کی بنیاد ہی ایرانی ہاتھوں سے پڑی، اسلئے اگر اس عہد میں ان کا اثر غالب ہو گیا، انکو امور سلطنت میں زیادہ درخور حاصل ہو گیا، تو جائے عجب نہیں،

۱۷ بڑے حقیقتاً کسی شخص کا نام نہ تھا بلکہ یہ اک لقب تھا جس سے پہنچ کے مشہور آتشکدہ نو بہار کا محافظ پکارا جاتا تھا۔ مسعودی کا بیان ہے کہ وہ شخص، جسکے سپرد یہ خدمت ہوتی تھی، بے انتہا مغرور و ممتاز خیال کیا جاتا تھا۔ اور جو دولت، ہدایا کی صورت میں جمع ہوتی تھی اسکا بھی انتظام اسی کے سپرد ہوتا تھا۔

قرظینی نے بھی آثار البلاد میں لکھا ہے کہ ترک اور ایرانی اس آتشکدہ کی بڑی عزت کیا کرتے تھے۔ آتشکدہ کی لمبائی اور چوڑائی سو سو ہاتھ تھی اور باندی اس سے کچھ زائد۔ اسکی حفاظت براقہ کے سپرد تھی، ہندوستان اور چین کے بادشاہ بھی یہاں آتے تھے اور برمک کے ہاتھوں کو بوسہ دیکر پرستش میں مصروف ہوتے تھے۔

یہ آتشکدہ اسوقت ٹنڈا ہوا جب حضرت عثمان غنی کے عہد میں خراسان فتح ہوا۔ اسوقت خالد کا باپ یہاں کا برمک (یعنی محافظ) تھا۔

کیونکہ خلفائے عباسیہ قدرتی طور سے اُن کی پاسداری پر مجبور تھے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اس کے اہل بھی تھے۔

یوں تو عہدِ عباسیہ کے اول خلیفہ، سفاح ہی کے وقت سے ایرانیوں کا اثر اور اسکے ساتھ اُن کی روشن خیالیاں نمایاں ہو چلی تھیں، لیکن اس کا شباب خلیفہ مامون کے عہد میں آیا، جسکی ماں اور بیوی دونوں ایرانی النسل تھیں، ہر چند خاندانِ برمک قریب قریب بالکل تباہ ہو چکا تھا۔ لیکن ایران کا ایک دوسرا خاندان اور موجود تھا، جس نے اسکی جگہ لے لی اور عربوں کو، جو مامون کے خلاف، امین کی طرف سے اک قسمت آزما جنگ کر چکے تھے، بدستور دربار خلافت سے الگ ہی رکھا۔

خلیفہ کے بعد سب بڑا درجہ وزیر کا تھا اور وہ اس عہد میں قریب قریب ایرانیوں ہی کے ہاتھ میں رہا۔ عہدِ عباسیہ سے قبل وزیر کا وجود نہ تھا بلکہ اسکے بجائے ایک شخص کا تب یا مشیر کے نام سے موسوم ہوتا تھا، جو قریب قریب ہی خدمت انجام دیتا تھا۔ سب سے پہلے عہدِ عباسیہ ہی میں وزیر کا عہدہ ایجاد کیا گیا اور اسکے فرائض مقرر کئے گئے۔

ہر چند یہ عہدہ قریب قریب ایرانیوں ہی کے ہاتھ میں تھا اور انہوں نے نہایت قابلیت سے اس خدمت کو انجام دیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ تھا حد درجہ خطرناک۔

چنانچہ ابو مسلم جسے امین آل محمد کہتے تھے، جس بُری طرح قتل کیا گیا، تاریخ کا مشہور واقعہ ہے اور ابو مسلم سے قبل جو وزیر (ابو سلمہ) تھا، اُسے خود ابو مسلم نے سفاح کے حکم سے جس بُری طرح ہلاک کیا

۱۵ اس کا نام پوران تھا جو حسن بن سہل کی بیٹی اور فضل بن سہل (مامون کے وزیر) کی بھتیجی تھی۔

ابن خلکان اور ثعالبی نے تفصیل کے ساتھ اس شادی کا ذکر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تمدن و معاشرت ارتقا کے کس درجہ پر تھے۔ اور نمود و نمائش، شان و شوکت کس حد تک پہنچ گئی تھی۔

مامون کی ماں کا نام مراجل تھا جو، ہر ات کی رہنے والی تھی۔ اور بصورتِ کینز، اُروں الرشید کے حرم میں داخل تھی۔

۱۶ اس لفظ کا ماخذ عام طور سے ذکر بتایا جاتا ہے چونکہ انتظامِ سلطنت کا تمام بار اسی عہدہ دار کے ذمہ ہوتا تھا اسلئے اُسے وزیر (بوجھ اٹھانے والا، ذمہ دار) کہتے تھے۔

بعض کا خیال ہے کہ یہ عرب ہے پہلوی لفظ وچیر کا مشتق ہے وہی جر، (فصلہ کرنا) سے یا گزیر کا جو تاملود میں پایا جاتا ہے۔ علامہ فخری کا بیان ہے کہ وزیر کا اشتقاق وزیر سے بھی ممکن ہے جسکے معنی ہیں جائے پناہ کے۔

وہ بھی کسی سے مخفی نہیں۔ ابو مسلم کے بعد ابوالجہم وزیر ہوا اور اس کو بھی خلیفہ نے زہر دیا۔ جب اسپر زہر کا اثر شروع ہوا اور وہ کمرہ سے اٹھ کر چلا تو خلیفہ نے پوچھا، ”کہاں چلے؟“ اُس نے جواب دیا ”جہاں آپ مجھے بھیجنا چاہتے ہیں۔“

اس وزیر کے بعد آل برہک کا عروج ہوا اور نصف صدی تک اس طغیانی کے ساتھ انہوں نے وزارت کی کہ تاریخ مشکل سے کوئی دوسری مثال پیش کر سکتی ہے۔ لیکن باوجود اس تمام اقتدار و اثر کے یہ بھی نہایت احتیاط سے اور ڈرتے ہوئے کام کرتے تھے کہ مبادا اُن سے کوئی حرکت ایسی سرزد ہو جائے جس سے اُن پر مجبوسی الاصل ہونے کی وجہ سے تعصب کرنیکا الزام عاید ہو۔

ایک بار خلیفہ منصور نے ابویوب کے مشورہ سے ارادہ کیا کہ ایوان کسریٰ کو منہدم کر کے اُس کے سامان سے دوسرا قصر طیار کرائے۔ جب خالد بن برہک سے ذکر آیا تو اُس نے کہا کہ ”امیر المومنین، ایسا نہ کیجئے، کیونکہ اسکو قائم رکھنا حقیقتاً اسلام کے نشانِ اقبال کو قائم رکھنا ہے۔ آئندہ نسلیں حب دیکھیں گی تو کہیں گی کہ کیسی کیسی سلطنتیں مسلمانوں کے قبضہ میں آگئی تھیں، علاوہ اس کے یہ وہ مکان ہے جہاں علی ابن ابی طالب نے نماز ادا کی ہے۔ لیکن اگر یہ باتیں قابلِ لحاظ نہ ہوں تو بھی اسکا مسمار کرنا اقتصادی نقطہ نظر سے مفید نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس کے برباد کرنے میں جس قدر صرف ہو جائے گا، اس سے کم میں اک نئی عمارت قائم ہو سکتی ہے۔“ منصور نے یہ سن کر جواب دیا کہ ”اے خالد، جب تو کوئی بات کہتا ہے تو ہمیشہ اس سے ایران کی پاسداری ظاہر ہوتی ہے۔“

خالد یہ سن کر خاموش ہو گیا اور منصور نے مسماری کا حکم دیدیا، لیکن چند دن بعد ہی منصور کو معلوم ہو گیا کہ اسکے توڑنے میں اندازہ سے بہت زیادہ صرف ہو رہا ہے اور خالد کا خیال صحیح تھا۔ اس لئے ایک دن اُس نے خالد سے کہا کہ ”میں بھی تمہاری رائے سے متفق ہوں اور ایوان کسریٰ کی مسماری کو میں نے بند کر دیا ہے۔“ خالد نے یہ سن کر کہا کہ ”امیر المومنین، اب اسکا مٹا دینا ہی مناسب ہے، کیونکہ جب آئندہ قومیں اسے نیم شکستہ حالت میں دیکھیں گی تو کہیں گی کہ خلیفہ منصور اس چیز کو بگاڑ بھی نہ سکا، جس کو ایک قوم نے بنایا تھا۔“ ہر چند خالد کی دونوں رائیں صائب تھیں لیکن منصور نے کسی پر عمل نہیں کیا۔

الغرض عہدہ وزارت، اُس زمانہ میں بے انتہا نازک تھا لیکن باوجود تمام خطرات و خدشات کے ایرانیوں نے اس جگہ کو ہاتھ سے نہیں دیا اور آہستہ آہستہ اُن کی تہذیب و معاشرت نے عربوں میں

رسوخ حاصل کر لیا۔ پہلے مسلمانوں میں جشنِ نوروز کا رواج نہیں تھا، لیکن عہدِ عباسیہ میں ہر شمس سال کے پہلے دن جب آفتاب برجِ حمل میں جاتا ہے، جشن منایا جاتا تھا۔

خلیفہ ہادی، ہارون اور مامون کے عہد میں ایرانیوں کے اثرات انتہائے عروج تک پہنچ گئے تھے اور مامون کے تو اکثر وزیر ایرانی یا ایرانی النسل تھے۔ بغداد میں ایرانی وضع عام ہوتی جاتی تھی۔ نوروز، مہرگان اور رام کی ایرانی تقریبات نہایت اہتمام سے عمل میں آتی تھیں۔ درباری لباس بھی ایرانی تھا حتیٰ کہ کوئی شخص بغیر قلنسوہ (مخروطی شکل کی لائبی سیاہ ڈوپٹی) کے خلیفہ کے حضور میں آہی نہ سکتا تھا۔ ساسانی بادشاہوں کے بہت سے آداب داخل دربار ہو گئے تھے۔ خلیفہ المتوکل کا ایک سکہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بالکل ساسانی لباس میں رہا کرتا تھا۔

پھر ایرانی اثر صرف انتظامی معاملات سلطنت تک محدود نہ تھا بلکہ علوم مذہبیہ میں بھی یہ لوگ صفِ اول میں شمار کئے جاتے تھے۔

عہدِ جاہلیت میں، عرب لکھنے پڑھنے سے بالکل ناواقف تھے اور انہیں اپنے امی ہونے پر ناز بھی تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان کی شاعری اور فخرِ انساب اک ایسی بڑی دولت اُن کے پاس ہے کہ اسکے ہونے ہوئے دنیا میں پھر کسی چیز کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اُنکا خیال تھا کہ جو شخص شاعری کے علاوہ کسی اور فن یا علم کی طرف متوجہ ہوتا ہے وہ اپنے حقیقی فخر کو ضائع کر دیتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے تھے کہ جو قوم اپنے تیر و کمان، نیزہ و تلوار سے کام لینا جانتی ہے اُسے کسی تعلیم کی ضرورت نہیں ہے اور اگر ہے تو صرف اس قدر کہ وہ اپنے قوم کی پرانی تاریخ اور اپنے خاندان کے قدیم انساب کو محفوظ رکھے۔

رسول اللہ کے مبعوث ہونے کے بعد بھی عربوں کا یہی حال تھا اور وہ مطلقاً تعلیم کی طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے۔ چنانچہ یہی کمی تھی جبکہ خیال کر کے رسول اللہ نے جنگِ بدر کے قیدیوں کے متعلق یہ حکم دیا تھا کہ اُن میں سے لکھنا جانتے ہیں وہ آزاد ہیں، بشرطیکہ قریش کے بچوں کو لکھنا سکھائیں۔ وادی کے حوالہ سے بلاذری نے فتوح البلدان میں لکھا ہے کہ ابتدائے اسلام میں قریش کے امرا میں سے

۱۵ ذوالرمہ جو قدیم بدوی شعرا کی آخری گڑھی تھا، لکھنا جانتا تھا، لیکن اسے ہمیشہ اس حقیقت کو چھپایا، کیونکہ عربوں میں فنِ تحریر کا جاننے والا لنگا ہوں سے گر جاتا تھا۔

صرف ۱۰ آدمی لکھنا جانتے تھے جن میں حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عثمان، ابن ابجر، طلحہ، ابوسفیان، اور امیر معاویہ بھی شامل تھے۔

برخلاف اس کے ایرانیوں کی یہ حالت تھی کہ قدیم ساسانی عہد میں ہی کوئی بادشاہ اس وقت تک مکمل طور سے سلطنت کا اہل نہیں سمجھا جاتا تھا جب تک وہ فنِ تحریر سے واقف نہ ہو۔ پھر ہی نہیں تھا کہ وہ صرف اپنی مادری زبان پر عبور رکھتے ہوں بلکہ (ظہور اسلام سے قبل ہی) وہ عربی زبان ہی حاصل کرتے تھے چنانچہ ہر ام گور جس کی تعلیم، اعرابِ حیرہ کے درمیان ہوئی تھی، علاوہ عربی، فارسی کے یونانی زبان بھی جانتا تھا اور ان تمام زبانوں کو اچھی طرح لکھ ہی سکتا تھا۔ عوفی نے تو اس کے عربی شعر بھی اپنے تذکرہ میں درج کئے ہیں۔ اسی طرح ایرانی گورنر یمن کا (خراسرو) تو بالکل عرب ہی بن گیا تھا اور اسی وجہ سے وہ اپنی جگہ سے ہٹا دیا گیا۔ الغرض ایرانی پہلے ہی سے عربی زبان سے مانوس تھے اور عرب اسلام نے عرب و عجم کو ایک کر دیا، اور اختلافِ مذہب بھی مٹ گیا تو پھر کثرت سے انہوں نے عربی زبان حاصل کی اور اس قدر سرعت کے ساتھ وہ عربی سناچہ میں ڈھل گئے کہ مشکل سے کوئی دوسری نظیر صفحات تاریخ پر مل سکتی ہے۔

پہلی صدی ہجری ختم نہ ہوئی تھی کہ عجم نے عربی زبان کے نحوی اور صرفی پیدا کر دیئے، چنانچہ پیش گست (ایرانی) سب سے پہلے وہ شخص تھا جس نے مدینہ میں بیٹھ کر عربی زبان کے قواعد مرتب کئے۔ اگر ان قابل لوگوں کی فہرست مرتب کی جائے جو اسلام کے قرونِ اولیٰ میں پائے جاتے تھے تو اس میں اکثر نام عجمی لوگوں کے ہونگے جو جنگی قیدی کی صورت سے عرب آئے اور موالیٰ کی حیثیت سے اسلام کی نہایت عمدہ خدمات انجام دیں۔ ابواسحاق کا دادا، جس کی سیرت نبوی، ابتدائے اسلام کی بہترین تاریخ ہے۔ ابوموسیٰ نصیر جو تاریخِ اندلس کا خاص شخص ہے۔ ان کے علاوہ اور بہت سے لوگ جنہوں نے ادب و حکمت، سیاست و مذہب کے علوم میں مخصوص شہرت حاصل کی، سب کے سب ایرانی یا ترکی نسل کے تھے، جو بحیثیت موالیٰ کے عرب میں رہتے تھے۔ خلیفہ عبد الملک اور فقیہ الزہری کے درمیان جو گفتگو ہوئی تھی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ، یمن، مصر، شام، عراق، خراسان، کوفہ، اور بصرہ میں ہر جگہ عمدہ قضا موالیٰ ہی کے ہاتھ میں تھا اور کسی عرب کو یہ مرتبہ حاصل نہیں ہوا۔ چنانچہ خلیفہ کو اس پر تعجب ہوا تو الزہری نے جواب دیا کہ ”امیر المؤمنین یہ تو خدا اور اسکے مذہب کی پیروی

کا نتیجہ ہے جو مذہبی احکام پر عامل ہو گا وہی ترقی کر سکے گا۔

اس میں شک نہیں کہ عرب نے ہمیشہ عجم سے نفرت کی اور باوجود اسکے کہ مذہب نے ان دونوں کو ایک سطح پر لا کر کھڑا کر دیا اور تفریق قومی کو یکسر مٹا کر رکھ دیا تھا، تاہم اہل عرب نہ اہل عجم سے خوش تھے اور نہ ان کے ساتھ اپنے تعلقات وسیع کرنا چاہتے تھے، لیکن اس کا کیا علاج کہ موالی عجم اپنے فہم فراست، اپنی قابلیت و ذہانت سے آہستہ آہستہ ترقی کرتے جا رہے تھے اور عہدِ نبویؐ میں بھی جو خالص عربی حکومت کا دور تھا، انہوں نے نمایاں امتیاز حاصل کر لیا تھا اور زمانہ کی رفتار کچھ دیتی تھی کہ وہ دن بہت جلد آنے والا ہے، جب عجم، عرب کو پس پشت ڈال کر خود بروئے کار آ جائیگا۔ چنانچہ عہدِ عباسیہ میں یہ نتیجہ ظاہر ہو کر رہا اور ایرانیوں کے غیر معمولی عروج نے عربوں کو آتش زیر پا کر دیا۔ چونکہ عرب کو اپنے نسب پر بڑا فخر تھا اور وہ غیر اعراب پر طعن و تشنیع سے باز نہ آتے تھے، اس لئے ان کے مخالف ایک اور گروہِ شیعہ بیدار ہو گیا، جس نے نہ صرف یہ دعویٰ پیش کیا کہ مذہبِ اسلام نے تمام قوموں کو برابر کر دیا ہے بلکہ یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی کہ عربوں کی قوم اکثر قوموں سے کمتر درجہ کی ہے۔

ایک بار ابوتامام نے خلیفہ کی شان میں ایک قصیدہ پڑھا جس میں اُسے قبیلہ طے کی مشہور ہستی حاتم سے تشبیہ دی تھی۔ وزیر نے سنکر شاعر کو تنبیہ کی کہ آئندہ ایسی جرأت نہ کرنا کہ امیر المومنین کے مقابلہ میں وحشی عربوں کا ذکر کرو۔

شعوبیہ گروہ کی مختلف جماعتیں تھیں اور ہر جماعت اپنے اپنے ملک کی طرفدار بنی کرتی تھی، لیکن ان میں سب سے زیادہ ذمی اثر ایرانی جماعت تھی۔ اس عہد کے امرا ایران اپنے نسب ناموں کو بھی اسی طرح محفوظ رکھتے تھے جس طرح عرب۔ اور اس لئے شعوبیہ جماعت نے اس باب میں بھی عربوں پر حملہ کیا، جو زیادہ بجا نہ تھا اور اگر اس خصوصیت کو نگاہ رکھا جائے کہ وہ عربوں کے انساب کا بھی کافی علم رکھتے تھے بلکہ بعض اوقات خود عربوں کو اپنے آباؤ اجداد کے تاریخی حالات ایرانیوں سے دریافت کرنے پر پڑتے تھے، تو ایرانیوں کا یہ فخر بالکل حق بجانب نظر آتا ہے۔

ایرانی بے انتہا ذہین تھے، وہ سمجھتے تھے کہ عربوں میں کیا کمزوریاں ہیں اور وہ ان سے کس طرح فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ چنانچہ یہ ذوق اس قدر بڑھ گیا کہ مختلف کتابیں عربوں کی تحقیر و تذلیل میں لکھی

گیس اور شعوہیہ جماعت نے عربوں کو سخت پریشان کر دیا۔ اسحاق بن حسان الحزمی، ابو عثمان، سعید بن حمید بن بختگان۔ ابو سعید الرستمی اور ابو ریحان بیرونی خاص خاص لوگ شعوہیہ جماعت کے تھے جنہوں نے عربوں کے خلاف مستقل تصانیف مرتب کر دیں۔

شعوہیہ جماعت کی یہ جنگ صرف انتساب اور زبان کے معاملے تک محدود تھی، کیونکہ ان ہی دونوں باتوں پر عربوں کو فخر حاصل تھا اور اگر انصاف کیا جائے تو اس جنگ میں بھی ایرانی ہی کامیاب ثابت ہوئے۔ اسکا بڑا سبب یہ تھا کہ ایرانی، عربوں کی قدیم تاریخ سے پوری طرح واقف تھے اور انہیں معلوم تھا کہ اس میں کہاں کہاں کمزوریاں پائی جاتی ہیں، چنانچہ انہیں کو وہ نمایاں کر کے دکھاتے تھے برخلاف عربوں کے کہ وہ ایرانیوں کی تاریخ سے بالکل ناواقف تھے اور انکے پاس کوئی ذریعہ ایرانیوں کو زک دینے کا نہ تھا۔

شعوہیہ میں ابو عبیدہ معمر بن المثنی نہایت قابل اور مشہور شخص گذرا ہے جس نے بتایا ہے کہ عربوں کی زبان کس حد تک ایران کی ممنون ہے، اور انہوں نے ایرانی فسانوں، ایرانی اصول فصاحت و بلاغت سے کس قدر استفادہ کیا ہے۔ حمزہ اصفہانی نے تو اس میں اس قدر غلو کیا ہے کہ وہ بہت سے عربی شہروں کے ناموں کو بھی فارسی زبان سے ماخوذ بتاتا ہے مثلاً بصرہ کے متعلق وہ کہتا ہے کہ اصل میں یہ بس راہ (دور کا راستہ) تھا اسی طرح صاحب دبتاں نے مکہ کی حقیقت ماہ گاہ (چاند کی جگہ) ظاہر کی ہے۔

ہر چند اس قسم کی تاویلیں بالکل ساقط الاعتبار ہیں لیکن اس سے یہ پتہ ضرور چلتا ہے کہ شعوہیہ نے عربوں کے خلاف کس قدر شدت و تعصب سے کام لیا۔ اور یہ غالباً انتقام تھا عربوں کے اس نخوت و پندار کا جو وہ عجمیوں کے مقابلہ میں ظاہر کیا کرتے تھے۔

شعوہیوں کے خلاف عربوں نے بہت کچھ لکھا، کتابیں تصنیف کیں، اپنے دعاوی پیش کئے ایرانیوں کے الزامات کا جواب دیا اور پوری طرح اپنی قوت ہجو بازی صرف کر دی، لیکن جب قدر شہرت شعوہیہ کو حاصل ہوئی وہ انہیں نصیب نہ ہوئی اور اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ایرانیوں میں علوم و فنون کا رواج تھا اور وہ اپنے وسیع الذرائع ہونے کے وجہ سے مقابلہ زیادہ کامیاب ہوئے۔

جب اسلام کی فتوحات میں وسعت پیدا ہونے لگی اور دیگر ممالک کے لوگ دائرہ اسلام میں

داخل ہوئے تو سب سے پہلے جس چیز کی طرف انہیں توجہ کرنے کی ضرورت ہوئی وہ عربی زبان تھی، کیونکہ وہ قوم جس میں آکر شامل ہوئے وہ کتاب جس کے ساتھ انہوں نے اپنی ساری زندگی وابستہ کر دی، عربی زبان سے متعلق تھی اور اسلئے ضروری تھا کہ وہ پہلے اس زبان میں پوری مہارت حاصل کرتے۔ پھر ظاہر ہے کہ ایک غیر قوم کو عربی زبان سیکھنے کے لئے صرف و نحو جاننے کی ضرورت تھی اور اس کے ساتھ اس کی لغات معلوم کرنے کی۔ لیکن چونکہ عربی زبان بہت وسیع زبان ہے اس لئے اسکے لغات و قواعد سیکھنے کے لئے قدیم اشعار کا تراجم کر کے یاد کرنا ضروری ہوا اور عربی شاعری سمجھنے کے لئے ان کے انساب و اخبار اور ان کی گزشتہ تاریخ کا علم لابد تھا اس لئے زبان عربی سیکھنے کے ساتھ ہی ساتھ عجمیوں کو صرف و نحو، لغت و تاریخ، علم الانساب والا یام، جغرافیہ و تاریخ کی طرف بھی توجہ کرنی پڑی جسکی عربوں کو چنداں ضرورت نہ تھی۔

اسی کے ساتھ جب آپ مذہب کی طرف آئیں گے تو معلوم ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قرآن سمجھنے اور احکام مذہب کے متعلق اقوال رسول اللہ کا استقصا کرنے کی غرض سے، اصحاب رسول اللہ اور تابعین سے استفادہ کی ضرورت تھی۔ تاکہ وہ عام معاشرت کے متعلق رسول اللہ کو فرمان بتائیں، لیکن چونکہ ہر حدیث کو حدیث نبوی ماننے میں تامل ہو سکتا تھا، اس لئے ہر حدیث کی اسناد طلب کی جائے لگیں، اور اس طرح رفتہ رفتہ اسماء الرجال کا فن مدون ہو گیا، جس کا اضافہ شعبۂ تاریخ میں صرف مسلمانوں نے ہی اول بار کیا اور آج تک کسی مذہب و تاریخ میں اسکی مثال نہیں مل سکی۔

پہلی صدی ہجری میں کوئی کتاب ایسی مرتب نہ ہوئی تھی جو زبان و تاریخ سیکھنے والوں کو مدد دے سکتی اس لئے جن کو عربی لٹریچر سیکھنا ہوتا تھا وہ بدویان صحرائین کے پاس جاتے تھے اور جنہیں احکام مذہب معلوم کرنا ہوتے تھے وہ مدینہ میں اصحاب رسول اللہ کی تلاش کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ طلب علم کیلئے مسلمانوں کو سفر و سیاحت زیادہ کرنی پڑی اور آخر کار یہ ذوق و شوق اس قدر بڑھ گیا کہ کھجول نے جو ایک مصری غلام تھے تمام حجاز، عراق، اور شام کا سفر صرف اس لئے کیا کہ مال غنیمت کی تقسیم کے متعلق رسول اللہ کی کوئی صحیح حدیث معلوم کریں۔ اور آخر کار زیادہ بن جاریہ التمیمی سے انہیں ایک حدیث ایسی دستیاب ہوئی جو حبیب بن مسلمہ الفہری سے روایت کی گئی تھی۔

اس کے ساتھ ایک وقت یہ بھی تھی کہ تمام مذہبی علوم صرف زبانی حاصل کئے جاتے تھے۔ چنانچہ

سب سے قدیم مذہبی کتاب کے شرکی، صرف ابن اسحاق کی سیرۃ نبوی تھی جسے ابن ہشام نے زیادہ مہذب مکمل صورت میں پیش کیا۔

پہلی صدی ہجری میں ابو ہریرہ، عبداللہ بن عمر بن العاص، الزہری، حن بصری وغیرہ چند نفوس ایسے تھے جنہوں نے اپنی معلوت کو نوٹ کی صورت میں مرتب کیا تھا، لیکن مرتے وقت وہ انہیں ہی تلف کر گئے۔ احادیث کو ضبط تحریر میں لانے کے لئے انحراف دوسری ہجری تک برابر قائم رہا چنانچہ عبدالرحمن بن ہرملہ السلمي کو مشکل سے ان کے استاد نے اجازت دی کہ وہ احادیث کو لکھیں۔ اس قدغن کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ لوگوں کا خیال تھا، ممکن ہے کتب احادیث کی ایسی عزت نہ کی جائے۔ جس کی وہ مستحق ہیں اور دوسرا سبب یہ تھا کہ کہیں لوگ صرف احادیث ہی کو اپنا معمول بنا کر کلام مجید کو نہ چوڑ بیٹھیں۔

یہ خیال صرف مذہبی کتابوں سے متعلق تھا ورنہ دیگر فنون کی کتابیں عہد بنو امیہ میں مرتب ہو چکی تھیں اور اکثر لوگوں نے اس طرف کافی توجہ صرف کی تھی۔ ان میں سے وہب بن منبہ (ایرانی النسل) عبید بن شریہ ابو المخنف بن یحییٰ، الزہری ان کے شاگرد عبدالرحمن العامری موطا کا مصنف اسد بن موسیٰ بن ابراہیم، محمد بن شیریں کتاب الجوامع کا مصنف محمد بن علی بن عمرو السالمی کتاب الاشارہ کا جامع خالد بن یزید (اموی شاہزادہ) علم الکیمیا کا ماہر اور اس کا شاگرد جابر بن حیان خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

یہ مصنفین عہد بنو امیہ کے تھے لیکن عہد عباسیہ میں انکی تعداد بہت بڑھ گئی اور ان میں عنصر غالب ایرانی النسل لوگوں کا تھا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عجم نے عرب کی کس قدر خدمت کی ہے، چنانچہ ابن المقفع (جو نجوسی النسل تھا اور ابن خلدون و ابن مقفع کے نزدیک بھی عربی زبان کا بہترین ماہر

۱۵۔ دونوں صفار کے رہنے والے تھے۔ عبید کا انتقال خلیفہ عبدالملک کے عہد میں ہوا اور وہب کا خلیفہ ہشام کے زمانہ میں

۱۶۔ اسکے تاریخی افسانے بہت مشہور ہیں حکومت بنو امیہ اور اس کا خاتمہ ساتھ ہی ساتھ ہوا۔

۱۷۔ یہ بھی خلیفہ ہشام کے عہد میں تھے۔

۱۸۔ امام مالک کی موطا بعد کو لکھی گئی ہے۔

۱۹۔ یہ کتاب الزہد کا مصنف تھا۔

تھا) عیسے بن عمر و الشقفی (جس نے سب سے پہلے عربی قواعد کو مرتب کیا اور خلیل بن احمد اور سیبویہ کو درس دیا) امام ابو حنیفہ (جو ایرانی النسل تھے)، حماد بن شاپور (سبعہ معلقہ کا جامع)، بشائر بن برد (ایرانی النسل اور عربی کا مشہور نابینا شاعر)، سیبویہ (مشہور نحوی)، علی بن حمزہ الکسائی، (ہامون و امین کا اتالیق) ابو نواس (دربار ہارون کا مشہور شاعر)، الفرار (کسائی کا مشہور شاگرد)، ابن قتیبہ (مشہور مؤرخ) خفیش (سیبویہ کا مشہور شاگرد)، قسطلی بن لوقا (بلبک کا عیسائی اور اپنے عہد کا بڑا زبردست ریاضی ہنر مند) وغیرہ سب غیر اعراب تھے، جنہوں نے اپنی قابلیت اور فضل و کمال کے غیر فانی نقوش تاریخ میں ثبت کر کے، یہ حقیقت واضح کر دی کہ اسلام کی مساوات نے عرب و عجم، دونوں کو ایک سطح پر لا کر کھڑا کر دیا تھا اور شریعت حقہ کے نزدیک وہی شخص مستحق عزت تھا جس نے اپنے اندر کوئی کمال پیدا کیا اور صرف فخر انساب کو ذریعہ امتیاز قرار نہیں دیا۔

قمر

اس مضمون کی ساری ترتیب صرف اس خیال پر منحصر ہے کہ بنو امیہ کی حکومت جو خالص عربوں کی حکومت تھی، ترقی علوم و فنون کے لئے زیادہ موزوں نہ تھی اور غیر اعراب کے ساتھ مساویانہ سلوک نہ کیا جاتا تھا۔ مغربی مکہ کا یہ تاریخ کی بنا پر یہ خیال آجکل زیادہ ترقی پذیر نظر آتا ہے، حالانکہ صاحب مضمون نے خود خلیفہ عبد الملک اور الزہری کے مکالمہ کا ذکر کر کے گویا خود ہی اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے کہ عہد بنی امیہ میں عہدہ قضا کے مالک تقریباً سب موالی تھے اور اس سے زیادہ روشن ثبوت، عربی حکومت کی رواداری اور خیال مساوات کا اور کیا ہو سکتا ہے۔ یقیناً عجم نے عہد بنی عباسیہ میں اکاسرہ ایران کی شان و شوکت کو دوبارہ زندہ کر کے دکھا دیا، لیکن کیا اس سے کسی کو انکار ہو سکتا ہے کہ یہی وہ ظاہری نمود و نمائش تھی جو آخر کار بغداد کی خلافت و حکومت کو کھا گئی اور یہی وہ کارنامہ اہل عجم کا ہے جس کا داغ اس کی عشرت پسندیشانی سے کبھی محو نہیں ہو سکتا۔

ادھر

ڈراما اور رومان

Drama and Romance

ڈراما اور رومان دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ جو واقعہ یا خیال صرف تفریح طبع اور عبرت کے لئے، قصہ کی صورت میں لکھی جائے، وہ رومان ہے اور جس سے مقصود یہ ہو کہ چند مخصوص افراد سے تمثیل کے طور پر ادا بھی کریں وہ ڈراما ہے۔

رومان اصل میں ایک قصہ ہے جو عوام کی زبان میں لکھا جاتا ہے۔ اس کا موضوع کبھی تاریخی ہوتا ہے (جیسے قصہ بنی ہلال اور سیرۂ عنترہ) کبھی محض وہمی اور خیالی، (جیسے کلیلہ اور دمنہ کے اکثر قصے) اور کبھی رمزى اور انتقادی، جس سے محض تادیب اور تہذیب مقصود ہوتی ہے۔ چونکہ لوگ قدیم زمانہ سے اس قسم کی حکایتوں سے دلچسپی لیتے چلے آئے ہیں، اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ قصہ گوئی انسانی تاریخ کے ساتھ ساتھ شروع ہوتی ہے تو بیجا نہ ہوگا۔

ابتداء میں رومان، اشعار کی صورت میں لکھا جاتا تھا، جس کے ذریعہ سے لڑائیوں کے حالات، انقلابات حکومت وغیرہ کے واقعات، قصے کی صورت میں بیان کئے جاتے تھے۔ پھر رفتہ رفتہ اس نے نظم و نثر میں مختلف صورتیں اختیار کیں، جس میں سب سے آخری اور مہذب صورت تمثیلی حکایات یا ڈراما کی ہے۔

ڈراما اور رومان دونوں میں انسانی اخلاق اور عادات کی تمثیل اور تشخیص ہوتی ہے اور جن قہج کے دونوں پہلو دکھائے جاتے ہیں، مگر فرق یہ ہے کہ ڈراما کا دائرہ رومان سے تنگ ہوتا ہے، کیونکہ ڈراما کا موضوع ایک ہیئت مخصوصہ سے تعلق رکھتا ہے، اور اس میں چند خاص امور کا التزام بھی ضروری ہے۔ برخلاف اس کے رومان ان قیود سے آزاد ہے اور اس کا میدان زیادہ وسیع ہے۔ ڈراما خصوصیت موضوع کو دیکھتے ہوئے، رومان سے زیادہ مشکل ہے، کیونکہ تمثیل واقعات کیلئے تمام لوازم اور عوارض کا جمع کرنا ضروری ہے تاکہ واقعہ، حکایت کی حد سے ترقی کر کے، حدود مشاہدہ میں داخل ہو جائے، اور حوادث کا پورا منظر نگاہ کے سامنے کھینچ جائے۔

قصہ گو، یا رومان نگار، زمان و مکاں کی قید سے آزاد ہوتا ہے اور اُسے تمثیلِ حوادث کیلئے تمام لوازم فراہم کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی، لیکن ساتھ ہی اسکے قصہ گو کو اس کی ضرورت ہے کہ بہترین اسلوب فصیح ترین تعبیر کے ساتھ، موثر پیرایہ میں اپنے مطالب کو ادا کرے، کیونکہ عبارت ہی ایک قصہ کو پُر لطف یا غیر دلچسپ بنا دیتی ہے۔

یونانی رومان | ابتدائے عہد کے رومان، صرف حوادثِ تاریخی پر مبنی ہوتے تھے اور تخیل سے کام نہ لیا جاتا تھا چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ سکندر اعظم کے بعد یونانیوں نے جس قدر قصے اور رومان لکھے ہیں اُن سب میں یونانیوں ہی کی فتوحات کا تذکرہ ہے۔ البتہ سلسلہ فتوحات میں غیر ملکیوں کی جو عجیب و غریب باتیں انہوں نے دیکھی ہیں، اُن کا ذکر ضرور کر دیا ہے۔ یونانیوں میں اس قسم کا سب سے پہلا رومان وہ ہے جو ”غرائب اور اے ٹولی“ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ رومان چند خیالی قصوں سے مرکب ہے، جن میں عشق و محبت کی داستان بھی شامل ہے۔ اسکے ایک زمانہ بعد ارسٹیدس پیدا ہوا، اسکے متعدد قصے لکھے، جن میں بیباکی اور مذاق کا پہلو زیادہ غالب تھا۔ ان قصوں کا مقصود یہ تھا کہ انہیں پڑھکر لوگوں میں خواہشاتِ نفسانی پیدا ہوں۔ اس لئے اُن میں ایسے عشقیہ مضامین، جن میں خلافِ تہذیب عریانی سے کام لیا گیا ہے کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ اٹلی میں بھی، ارسٹیدس کی تقلید میں بہت سے قصے لکھے گئے ہیں، لیکن زمانے نے ان سب کو ضائع کر دیا۔ یونانیوں کے ان قصوں میں علمِ الاضنام کی حکایات سے بہت کچھ مدد لی گئی ہے، جس کا زمانہ دراز تک یونان میں رواج رہا۔

ڈراما کی تفصیل | حکایتِ تمثیلی یا ڈراما کے ذریعہ سے انسان کے اخلاق و عادات کی تشخیصی مثال پیش کی جاتی ہے، اور اُن مختلف حالات کی تصویر کشی کی جاتی ہے، جو معاشرتِ انسانی کے تعلقات سے رونما ہوتے ہیں۔ ڈراما کا بیان ایسا ہوتا ہے کہ گویا صاحبِ قصہ یا جو شخص قصہ سے اصولی تعلق رکھتا ہے، سامنے موجود ہے۔

ڈراما کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم میں متانت و سنجیدگی کی رعایت ہوتی ہے اور اس کے پڑھنے سے خوشی، رنج، مشقت کے جذبات میں تحریک پیدا ہوتی ہے۔ دوسری قسم میں مذاق اور ہزلیات کا پہلو غالب ہوتا ہے اور اسکے ذریعہ سے کم ہمت اور زلیل لوگوں کی اخلاقی حالت دکھائی جاتی ہے،

پہلی قسم کو تراجید یا *Tragedy* (یا روایات متینہ اور دوسری قسم کو کومڈیا یا *Comedy*) یا روایات ہنرلیہ کہتے ہیں۔ موجودہ عہد میں اس ڈراما کو جسکا انجام غم پر ہو (*Tragedy*) اور جس کا نتیجہ مسرت انگیز ہو (*Comedy*) کہتے ہیں، لیکن پہلے ان دونوں کا مفہوم یہی تھا جو بیان کیا گیا۔

ٹریجڈی کی حقیقت | تراجید یا، یونانی لفظ ہے جو اصل میں تراگوڈیا تھا یعنی وہ گانا جو بکرے کے سامنے گایا جائے اس کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ یونانی اپنے معبود شراب (*Bacchus*) باخوس پر بکرے کی قربانی چڑھایا کرتے تھے، فصل انگور میں ہر سال باخوس کے گرد لوگ جمع ہوتے تھے اور خوشی و مسرت کے ترانے گاتے تھے۔ چونکہ یہ زمانہ شراب کی کثرت کا ہوتا تھا، اس لئے تمام لوگ شراب کے نشہ میں چور، گلی کوچوں میں گاتے اور طرح طرح کا مذاق کرتے پھرتے تھے، الغرض عشق، محبت اور تغزل اس موسم میں پورے شباب پر ہوتی تھی ایک مرتبہ ایک یونانی شاعر تھسبیس کو خیال ہوا کہ اگر اس موقع پر معبود باخوس کی مدح میں قصائد پڑھے جائیں کریں، یا تفریح طبع کے لئے ہومر وغیرہ مشہور شعرائے یونان کا کلام لوگوں کو سنایا جائے، تو زیادہ مناسب ہے۔ چنانچہ اس خیال نے عملی صورت اختیار کی اور عید باخوس میں ہر یونانی جماعت کے ساتھ ایک قصیدے خواں بھی رہنے لگا، جو مختلف اشعار کے ذریعہ سے، جذبات میں جنبش اور عواطف میں حرکت پیدا کرتا تھا۔ یونانی شوق سے یہ اشعار سنتے تھے اور سناتے والا گاتے وقت ایسی حرکات اور اشارات کرتا تھا جو مقصود کے سمجھنے میں مدد دیتے، اور قصہ کی صورت کشیلی، نظروں کے سامنے پیش ہو جاتی۔

یونان میں ڈراما کی ترقی | اس کے بعد اسخیلس نے قصہ خواں کے ساتھ ایک اور آدمی شامل کر دیا۔ اب یہ دونوں شخص سوال و جواب کے طریقہ پر قصہ کہنے لگے۔ اور اس ضرورت کے لئے ایسے قصہ اور حکایتیں وضع کی گئیں، جو سوال جواب کے اسلوب پر ہوں، اور لطافت معانی و تحریک عواطف کا بھی ان میں پورا لحاظ رکھا گیا ہو کچھ عرصہ کے بعد یونان میں فن انشا کے بڑے ماہر اور مشہور شاعر سوفوکلئیس اور اریسٹوٹلس پیدا ہوئے۔ سوفوکلئیس کا کلام نہایت سنجیدہ، پر معنی اور موثر ہوتا تھا۔ وہ اپنے قصوں میں ترغیب و ترمیم

دونوں پہلو رکھتا تھا۔ اربیدس اس مرتبہ کا شاعر تو نہ تھا لیکن پھر بھی اس کا کلام نہایت لطیف ہوتا تھا اور وہ اپنے خاص اسلوبِ تعبیر سے حیاتِ قلبی میں تحریک پیدا کر کے، جذباتِ محبت میں غیر معمولی ہیجان پیدا کر دیتا تھا۔ ان دونوں شاعروں کی بدولت فنِ تراجیہ یا تکمیل تک پہنچا اور یونان میں مخصوص مقامات معین کئے گئے، جہاں مختلف قصوں کی تمثیل اور شخصیں ہوتی تھیں۔ ان مقامات کو تھیٹر (لعب) کہتے تھے۔ لوگ اوقافِ فرصت میں وہاں جمع ہوتے تھے، عورتیں اپنے بہترین کپڑے اور زیور پہن کر وہاں حاضر ہوتی تھیں اور اسلاف کے کارناموں کو تمثیلی صورت سے بیان کیا جاتا تھا۔

ڈراما اور سلطنتِ روما | جب یونانی حکومت کا خاتمہ ہوا اور رومن سلطنت قائم ہوئی، تو رومن لوگوں نے بھی اپنے شہروں میں تھیٹر قائم کئے، جہاں وہ بیکاری اور فراغت کے اوقات میں جمع ہوتے تھے۔ ابتدا میں انہوں نے صرف یونانی تراجیہات کی تقلید کی، لیکن ان کے قصوں میں تحریکِ عواطف اور ہیجان جذبات کا پہلو بہت کم تھا، اور شاعر سنیکا بھی جو حسنِ عبارت اور دقتِ اسلوب کے لحاظ سے مشہور ہے، اپنے کلام میں وہ خصوصیت پیدا نہیں کر سکا جو ڈراما نگاری کے لئے ضروری ہے۔ ہرچند رومن افسانہ نویس اور وقائع نگار تحریکِ جذبات کی کوشش کرتے تھے، لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہوئے، کیونکہ ان کی روایاتِ تمثیل میں تکلف و تصنع کا رنگ صاف نظر آتا تھا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ رومن قوم میں جذباتِ شریفہ مفقود تھے، اور ان کا میلان صرف شہوتِ پرست، خونریزی اور فاحشانہ خواہشات تک محدود تھا۔ ان میں وہ لطیف اور نازک خیالات نہ تھے جو یونانی طبائع میں پائے جاتے تھے، بلکہ وہ قتل و غارت کے واقعات سے زیادہ لطف اٹھاتے تھے، چنانچہ ان کے نقطہ نظر سے نیروں بہت بڑا شخص (ڈراما نگار) تھا، جو اپنے قصوں میں بربریت اور الوحش کے شرمناک واقعات کو نہایت خوبی سے ادا کرتا تھا۔

ڈراما اور دیگر ممالک | سوفیکلس اور اربیدس کے ایک زمانہ بعد دنیا میں متہذبن قومیں پیدا ہوئیں اور انہوں نے تراجیہ کے اصلی ذوق اور مقصد کو پہچانا، ان میں بڑے بڑے شعراء اور اربابِ قلم پیدا ہوئے، جنہوں نے عواطفِ انسانی اور جذباتِ بشری کے مطابق حکایات اور قصے لکھے۔ قرونِ آخرہ میں فرانس کے اندر کورنیل، راسین، وولٹر، کرنیلوں، انگلستان میں شکسپیر اسپین میں لوبورڈی و بگا اور کلاڈرون، اٹلی میں پرسیسین، ٹورلے، اور مانی، جرمنی میں سیجلر اور غوبٹ

وغیرہ متعدد وقائع نگار گزرے، جن میں سے ہر ایک کا اسلوبِ بلاغت اور طرزِ تعبیر دوسرے سے علیحدہ ہے۔

ڈراما متاخرین کے نزدیک | متاخرین نے تراجم یا کاموضوع صرف یہ قرار دیا کہ اسکے ذریعہ سے حسیاتِ شفقت و عجب کی تخریک پیدا ہو، اور وہ اگر اس موضوع سے متجاوز ہوگا تو تراجم یا کے قسم سے خارج ہو جائیگا۔ تراجم یا کے لئے ایک شرط یہ بھی ہے کہ اس میں صرف پانچ فصلیں ہوں۔ اگرچہ چار سے بھی مقصود حاصل ہو سکتا ہے، لیکن پانچ زیادہ مناسب ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی ڈراما نگار، پانچ سے زیادہ فصلاں نہیں لکھتا، ڈراما کی ہر فصل میں چند حصے ہوتے ہیں جنہیں مشاہد (Scenes) کہتے ہیں ان حصوں میں مخصوص افراد کا مکالمہ ہوتا ہے، اور یہ صورت اسلئے اختیار کی جاتی ہے کہ واقعات کی ترتیب اچھی طرح ذہن مخاطب میں آجائے۔ اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اول سے آخر تک ایک ہی واقعہ بیان کیا جائے، تاکہ اجنبی واقعہ کے اختلاط سے حسنِ ترتیب فوت نہ ہو۔ ہاں اگر ایک ہی واقعہ کی متعدد فروع ہوں تو مضائقہ نہیں، نیز واقعہ کی وحدتِ زمانی و مکانی کی رعایت بھی ضروری ہے تاکہ سلسلہٴ حوادث، غیر منقطع طریقہ پر ذہن سامع میں مرتسم ہوتا جائے۔

بعض متاخرین نے ضرورت کے وقت اس قسم کے قیود سے آزاد ہونا بھی جائز قرار دیا ہے لیکن یہ آزادی سارے ڈراما میں نہیں ہوتی بلکہ ایک حلقہٴ فرعی میں ہوتی ہے۔

اصول فصاحت و بلاغت اور سلاستِ عبارت کا لحاظ بھی ڈراما میں نہایت ضروری ہے۔ ڈراما نگاری کے لوازم | ڈراما کے موضوع میں متانت اور سنجیدگی لازمی ہے اور موضوع کے موثر بنانے کے لئے شاہد کا طبعی ترتیب کے مطابق ہونا اور شخصیں کا فنِ نقل اور تقلید میں پوری طرح ماہر ہونا از بس ضروری ہے۔ ڈراما کو سب سے زیادہ دلچسپ بنانے والی چیز یہ ہے کہ واقعات اس طرح بیان کئے جائیں کہ ہر واقعہ سُنے اور دیکھنے کے بعد آئندہ واقعہ کی طرف شدید اشتیاق پیدا ہو اور اس کی صورت صرف یہ ہے کہ ترتیبِ حوادث اور فاصلہٴ واقعات اس طرح قائم کیا جائے کہ ہر واقعہ آئندہ کے ساتھ شدید ارتباط اور تعلق رکھتا ہو اور عجب و شفقت کا سلسلہ بھی ہر واقعہ میں پایا جائے، یہاں تک کہ آخری فصل میں موت یا قتل پر قصہ ختم کر دیا جائے

تاکہ اس کا اثر طبائع میں باقی رہے، کیونکہ طبیعت میں وہی بات دیر تک باقی رہتی ہے جو زیادہ موثر ہو اور آخر میں بیان کیجائے، نقل واقعات کے وقت مشخصین کو آداب مجلس اور احترام حاضرین کی رعایت بھی لازمی ہے۔

کیڈی | کوڈیا وہ تمثیل ہے جس میں مضحکہ خیز واقعات اور ایسے حوادث بیان کئے جائیں، جو پست اور رذیل لوگوں سے تعلق رکھتے ہوں، لیکن کوڈیا کے مصنف کے لئے لازمی ہے کہ وہ اپنی تالیف میں ایک مفید غایت اور عبرت خیز نتیجہ کا لحاظ رکھے، تاکہ اسکے سُننے سے عقول میں اصلاح اور اخلاق میں تہذیب پیدا ہو۔ جن افراد کی تشخیص اور تقلید کوڈیا میں کی جاتی ہے، اُن کے اخلاق و عادات کی پوری تصویر و کامل تقلید ہونی چاہیے۔ چونکہ کوڈیا کا مقصود ہے کہ لوگوں کے اخلاق اور عادات کی تمثیل پیش کی جائے، اس لئے ہر قوم اور ہر زمانہ کا کوڈیا دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ انگریزوں کی نظر انور مادیہ کی طرف زیادہ رہتی ہے، ذاتیات اور شخصی صفات پر ہر ایک انگریز تازہ کرتا ہے۔ اٹلی والے اپنے اجداد کی جامد اور غیر متحرک طبائع کی تقلید کرتے ہیں اور فرانس کی نظر چونکہ اغراض ذاتی کی طرف نہیں ہے، اسی وجہ سے ان کے ڈرامے سب سے زیادہ لطیف، موثر، عبرت خیز اور عامۃً بشری کے لئے مفید ہوتے ہیں۔ سب سے زیادہ مشہور کوڈیا نگار مشاعر مویار تھا۔ جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ روئے زمین پر اس کا نظیر نہیں تھا۔

کیڈی کی تاریخ | چونکہ عادات و اطوار کا اختلاف ہر زمانہ میں قائم رہا ہے، اس لئے اگر کوڈیا کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے گی تو معلوم ہوگا کہ ہر قوم اور ہر زمانہ کا کوڈیا دوسرے سے مختلف ہے۔

کوڈیا کی ایک قسم اوپیرا، یا اوپیرا کومیک ہے اور یہ اصل میں ایک لطیف قصہ ہوتا ہے جسکی بنیاد مسرت بخش اور طرب انگیز واقعات پر ہوتی ہے، جس کے ساتھ رقص و سرود اور نفحات موسیقی بھی شامل ہوتے ہیں اور قصہ کی لطافت بڑھانے کے لئے جا بجا اشعار بھی آتے رہتے ہیں۔ روایات تشخیصی کے ابتدائی دور سے کومیک اس کے ساتھ ساتھ ہے، پندرہویں صدی عیسوی سے اٹلی والوں نے ہی اسکی نقل شروع کی ہے۔ چنانچہ یہ لوگ خوشگوار موسسم میں شراب پی پیکر کومیک

کا صنف اٹھاتے ہیں اور منظومات کو میٹک میں اپنے اسلاف کے زرین کارنامے اور ان کی قابل تقلید اعمال کی نقل کر کے طبائع میں تشویق اور تحریص پیدا کرتے ہیں۔

فرانس میں بھی اویسیر یا کو میٹک ایتالیہ سے داخل ہوا ہے، سترہویں صدی میں ایک قانونی اویسیرا، فرانس میں قائم کیا گیا، جس میں شاعر کو ریل کی منظومات خاص دل چسپی سے پڑھی جاتی تھیں۔ اسکے بعد مولیاری اور کینول کا زمانہ آیا، انگلستان میں ملٹن نے اٹالوی طرز پر اس فن کو رواج دیا، لیکن انگلستان، سوڈن اور اسپین میں سترہویں صدی کے بعد اس فن کی تکمیل ہوئی اور تمام ممالک کے مقابلہ میں اٹلی، جرمن اور فرانس کی موسیقی زیادہ مکمل ثابت ہوئی۔ بعد میں شعراء نے کوڈیا میں اسقدر تصنع کیا کہ اسے کوڈیا، تراجد یا اور تمام امور مطربہ کا مجموعہ بنا لیا۔

کوڈیا کی ایک قسم فارس (Fars) بھی ہے۔ یہ ایک ادنیٰ قسم کا کوڈیا ہے جس سے مقصود صرف لوگوں کو ہنسانا ہوتا ہے۔ چونکہ اسمیں ہزلیات اور مضحکات زیادہ ہوتے ہیں، اس لئے عوام میں زیادہ مقبول ہے، اٹلی، اسپین اور فرانس کے ڈراموں میں اسکا رواج کثرت سے ہے اور شکسپیر نے بھی اسمیں حصہ لیا ہے، مولیاری نے بھی اس قسم کے چند قصے لکھے ہیں، لیکن اسنے طبعی حدود سے تجاوز نہیں کیا۔

ناول اور ڈراما مفید چیز ہے اور تہذیب اخلاق، تحسین عادات، اور تحریک حسیات میں اس سے بہت مدد ملتی ہے۔

کیڈی اور یونان | کوڈیا کی شہرت یونان میں بمقابلہ تراجد یا کے بہت ہوئی، کیونکہ یونانی طبائع میں وقار و سنجیدگی کا پہلو غالب تھا، اور وہ ہزلیات کو پسند نہ کرتے تھے، بعد کو اس میں اسقدر احتیاط کی گئی کہ قانونی طریقہ پر کوڈیا تصنیف کرنے کی ممانعت کر دی گئی، لیکن بعد میں رفتہ رفتہ اس نے بھی ترقی کی اور اس کے ذریعہ سے ارباب حکومت، اُمراء اور دوسرے طبقات کے اخلاق و عادات کی تمثیل ہونے لگی، اس میں سب سے زیادہ حصہ ارسٹوفانس نے لیا بعد کو جب حکومت نے دیکھا کہ کوڈیا کے ذریعہ سے اخلاق کی اصلاح ہوتی ہے تو اسنے ارسٹوفانس کی ہمت افزائی کی۔

عورتیں کوڈیا میں شریک نہیں ہوتی تھیں کیونکہ شریف طبعت افراد اس سے نفرت کرتے

تھے اور یونانیوں کا علو نفس اس کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ عورتوں کا ذکر ایسی مجالس میں آئے لیکن موجود زمانہ کی یورپین تہذیب نے عورتوں کو بالذات ملاعب میں داخل کر دیا اور بغیر ان کے کوئی تھیٹر مکمل نہیں ہو سکتا۔

ایٹلیج کی تعمیر | ابتدا میں اہل یونان کے ملاعب یا تھیٹر کی عمارت لکڑی کی ہوتی تھی۔ اسکے لئے سب سے پہلے پختہ مکان یونان میں نمسکلیس نے بنایا۔ اس کے بعد اور بہت سے ملاعب تعمیر کئے گئے۔

یونانی ملاعب میدان میں بہت کم ہوتے تھے، بلکہ اکثر ہارڈ کے دامن میں بنائے جاتے تھے تاکہ دیکھنے والوں کو آسانی ہو۔ ملاعب کا منظر شمال کی طرف رکھتے تھے تاکہ دیکھنے والوں کے سامنے سورج کی شعاعیں نہ پڑیں۔ عمارت کے دو حصے ہوتے تھے ایک حصہ میں دیکھنے والے بیٹھتے تھے اور ایک میں مشخصین، حرکات تمثیلی کرتے تھے۔ تماشا یوں کی نشستگاہ نصف دائرہ کی صورت میں ہوتی تھی اور اس میں سیڑھیاں بنی رہتی تھیں تاکہ آگے والا شخص پیچھے والے کی نظر میں حائل نہ ہو، جو سیڑھیاں سب سے بلند ہوتی تھیں وہاں عام لوگ، پھر ان کے نیچے درجہ بدرجہ خواص کی نشست ہوتی تھی، جنہیں حکام، قضاة اور امراء سب شامل تھے۔

رومن ملاعب میں یہ ترتیب نہ تھی بلکہ مرد عورتیں، امیر و غریب سب ملے جلے بیٹھتے تھے اور جسے جہاں موقع ملتا تھا بیٹھ جاتا تھا۔ قیصر انکسٹس کے زمانہ میں رومانی ملاعب میں بھی نشستگاہیں مخصوص اور بالترتیب کر دی گئی تھیں۔ یونانی اور رومن تماشا گاہوں میں عورتوں اور غلاموں کیلئے مخصوص جگہیں ہوتی تھیں جو محل شخص سے دور ہوتی تھیں۔ محل شخص کے قریب ہی گائے والوں کی نشست ہوتی تھی، جہاں کسی دوسرے کو بیٹھنے کی اجازت نہ تھی۔ محل شخص کی آرایش کیلئے خوبصورت تصویریں اور حوادث تاریخی کے نقشے ہوتے تھے، اور اس کے پیچھے وہ جگہ ہوتی تھی، جہاں مشخصین، ضرورت کے وقت اوضاع و لباس بدلتے تھے۔

رومیوں اور یونانیوں کے نزدیک معابد کے بعد ملاعب ہی کا مرتبہ ہوتا تھا۔ یونان میں متعدد ملاعب کے آثار پائے گئے ہیں۔ اسپارٹا کا ملاعب سب سے زیادہ خوبصورت اور سنگ مرمر کا بنا ہوا تھا۔

ملعب ایجینی کے آثار میں ہزار (میلو) کا عجیبہ نکلا ہے جو اس وقت پیرس کے عجائب خانہ میں محفوظ ہے ایشیائے کوچک اور صقلیہ میں بھی متعدد تھیسٹروں کے آثار نکلے ہیں۔

روما میں بھی ملاعب کے آثار پائے جاتے ہیں۔ روما کا سب سے پہلا ملعب، بنائے ۳۵۰ سال بعد تعمیر ہوا تھا۔ روما میں ملاعب کی عمارت مکڑی کی ہوتی تھی، جہاں لوگ کھڑے کھڑے تماشا دیکھتے تھے روما کا سب سے پہلا تھیٹر بنائے ۶۹۹ برس بعد بنا تھا، یہ عمارت اس قدر وسیع تھی کہ اس میں ۴۰ ہزار آدمی آسکتے تھے۔ اسکے قریب ایک والان بنایا گیا تھا، جس میں ایک سو ستون تھے جہاں پانی برستے وقت لوگ آکر ٹھہر جاتے تھے۔ اسکے علاوہ اور بہت سے ملاعب کے آثار زیر زمین پنہاں ہیں، جنہیں سے بہت معام کر لئے گئے ہیں اور بہت سے ابھی زیر خاک پوشیدہ ہیں۔ فرانز اٹلی، اور اسپین میں بھی متعدد آثار تھیٹروں کے موجود ہیں۔

جب یورپ میں غلبہ مسیحیت ہوا، تو تھیٹروں کی رسم جاتی رہی، کیونکہ مسیحی، قدیم بت پرستوں کی رسوم سے سخت نفرت کرتے تھے۔ بعد کو جب مسیحیت کم ہو کر، علوم و فنون کی اشاعت ہوئی، تو سب سے پہلے اٹلی میں قدیم طرز کا ایک تھیٹر بنایا گیا، جس میں ۹ ہزار آدمی بیٹھ سکتے تھے، (اب یہ عمارت منہدم ہو چکی ہے) پھر رفتہ رفتہ یورپ کے تمام شہروں میں متعدد تھیٹر قائم ہوئے اور اصلاحات ہوتے ہوتے ان کی موجودہ صورت ہو گئی۔ اس وقت دنیا میں سب سے زیادہ خوبصورت تھیٹر پیرس کے ہیں اور بدترین ہندوستان کے۔

نیاں

غزل

توئی واعظا و ہوشے و کنار امن کو شے	من لغزشے وسیلِ خم چشم میفروشے
نگہ ستم پرستم، چہ شوخ بے ندام	ز نگاہ کیف پرور اگر م دہی تو نوشے
چہ زید کے بہ عید نگہ کرشمہ سازت	کہ چکد ہزار بابل ز نگاہ سحر کو شے
چو شد ست حق پسندے بہیں مقال واعظ	نہ دہی مرا خدایا، سرگوشِ حق نیوشے

نہ نیاز ہم رہو دے دل پر سکوں چو دیدے
سحرِ بیاض گردن، قہرِ بہمنہ دو شے

نیاں

لالہ رُخ

”ایران کا نقاب پوش پیر“

(سلسلہ اشاعت ماضی)

”اے عظیم، اے تصویرِ شبابِ مردانگی! تو نے دشمنوں کے مقابلہ میں، اپنی شہادت کا ثبوت دیا ہے اور ان کے شدید حملوں کی مدافعت کی ہے۔ تو نے دنیا کے صعب ترین حالات میں دشمنوں سے اپنی شجاعت کا اعتراف کرایا ہے، مگر طیارہ ہو جا کہ آج تیرا شدید ترین امتحان ہونے والا ہے۔ آج تو، حریمِ مقنع میں داخل ہو گا، جہاں ہر حصہ زمین کا حُسن، اپنی نقشِ انگیز نگاہوں سے تجھ پر تیروں کی بارش کرے گا، جہاں مہلک ترین نشترِ تجھ پر آزمائے جائیں گے، اور جہاں عشق کے دیوتا کے پاس، ہر رنگ و ادا کا حربہ تجھ پر صرف کرنے کے لئے مہیا ہو گا۔ پھر کون کہہ سکتا ہے کہ وقت پر کون سا خنجر، کونسا تیرا سکے ہاتھ آجائے۔ گھنٹی اور دروازہ پلکوں کے اندر چمک جائیو الے پارہ ہائے برق، جھٹکے ہوئے پوٹوں میں نگاہوں کے عریاں خنجر، آج تیری ہمت و جرات کا امتحان کرنے والے ہیں۔ پھر یاد رکھ کہ وہ نوجوان، جو اک حُسنِ دلربا، ایک شبابِ سحر خیز کو اپنی آغوش میں لے لیتا ہے، لیکن آلودگی سے پاک رہتا ہے، اس کے سحر سے متاثر ہوتا ہے مگر ترغیباتِ ناپسندیدہ سے آلودہ نہیں ہوتا، وہی صحیح معنی میں فاتح ہے!“

اس وقت حریمِ مقنع میں آرائش و زیبائش کا اہتمام ہو رہا ہے، خادمہ لڑکیاں ادھر سے ادھر پھر رہی ہیں۔ ایک کو اگر طرہ سر کی زیبائش میں کمال حاصل ہے، تو دوسری فنِ نقاب انگنی میں ماسر، کہ کس طرح اس میں اندازِ تغافل پیدا کیا جاسکتا ہے۔ ایک اگر فنِ خوابندی میں بے مثل ہے، کہ انگلیوں کی پوریں کس ترکیب سے ایسی خوش رنگ رنگی جاسکتی ہیں کہ اگر ان کا عکس آئینہ پر پڑ جائے تو تیرا آبِ شاخِ مرجاں کا لگا ہوا ہونے لگے، تو دوسری تحریرِ سرمہ میں کمال رکھتی ہے اور جانتی ہے کہ کن آنکھوں کو کس وقت شوخ نگاہی کی ضرورت ہے کہ بے انہیں چشمِ بجار ہونا چاہیے اور وہ

خوبی جس کے لئے دوشیزہ سرکشیا، شاہان ذمی اقتدار کو بیتاب بنادینے میں شہرت تامہ رکھتی ہے، آنکھوں میں، کیونکر پیدا کی جاسکتی ہے۔

الغرض، اس وقت وہاں ہر شے متحرک اور ہر جز جنبش میں ہے، طرہ زر، گوہر آب دار اور جوامہ تابناک ہر طرف جگمگا رہے ہیں۔ چند کنیزیں باغ کے تختہ ہائے گل میں سے، چاندنی سے دھوئے تازہ پھول، چُن کر لائی ہیں کہ سنورنے والیوں کے جوڑوں میں لگائیں۔ مسرور و مسرشار دوشیزہ ہند چھپا کی کلیوں کو دیکھ کر کس قدر متحیر نظر آتی ہے، جو اُسے اس وقت کی یاد دلاتے ہیں، جب اس کے ساتھ کھیلنے والیاں، کنارِ گنگا پر انہیں چپا کو پہنچا دیں، اس کے بالوں کو سجایا کرتی تھیں، اور ناظرہ عرب کیسی مسرت مسرت ہے جسے مُر کے شگوفوں کی نکمت نے پھر اکیلا برسرِ زمین عرب میں پہنچا دیا ہے۔

ان وسیع و منور ایوانوں میں، جہاں فواروں کا سمیں تقاطر ایک عجیب و غریب ترنم پیدا کر رہا ہے، گہوتا ہوا، عظیم ایک بڑے قصر میں داخل ہوتا ہے۔ وہ حیران ہے کہ اس دنیا کے نور میں، آثارِ زندگی کیوں نہیں؟ فرش کی نظر فریبی، تقریبی مجردوں میں عود و صندل کا سلگنا، اگر کی بتیوں کا چاروں طرف فضا میں تعجب آمیز اثر پیدا کرنا، یہ سب کچھ ہے مگر کوئی صورت انسانی نظر نہیں آتی۔ اس ایوان میں داخل ہوتے ہی اس کی نگاہیں روشنی و تابانی کے ایک سمندر میں غوطہ زن ہوتی ہیں۔ وسط ایوان میں ایک خوبصورت فوارہ پانی کو اچھال رہا ہے، جو سقفِ مذکور کے زکاربھوں کو چھو چھو کر مرمین فرش پر گر رہا ہے۔ اس کے چڑھتے ہوئے پانی میں رنگین روشنیاں اس طرح منعکس ہوتی ہیں گویا قوسِ قزح کو پارہ پارہ کر کے اُس میں ملا دیا گیا ہے۔ ایک طرف ظروفِ بلورین کے اندر شفاف و پاکیزہ پانی میں چھوٹی چھوٹی رنگین مچھلیاں چمک رہی ہیں، گویا پرستانی معدن سے نکلے ہوئے سونے کے ٹکڑے ہیں، جو پانی میں ڈال دئے گئے ہیں۔ دوسری جانب صندلین پنجروں میں انواع و اقسام کے خوبصورت پرند آویزاں ہیں۔ مسرت و مسرور کنارِ می، عرب کے نیلگوں کبوتر، ہندوستانی شاما، جوشوالوں کے کنگروں پر بیٹھ کر اپنے پاکیزہ نغموں کی بارش کرتی رہتی ہے، وہ مرغِ غنِ طلا رنگ جو فصل کی طیاری کے زمانہ میں باغوں میں آجاتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے انہوں نے کوئی ایسی خوشبودار، مغیر شے کھالی ہو، جس کی مستی نے ان کو اس طنیانی بہار کا والد و شید ا بنا دیا ہے، اور وہ چڑیاں جو عربستانی آفتاب کے اندر

شکوہ بارالائی کے درخت میں گھونسل بنانی ہیں۔ الغرض تمام نادرو حسین پرندے جو فضا کے پاکیزہ میں
بال کشا ہو سکتے ہیں، یہاں مصروفِ ترنم ہیں اور حقیقی معنی میں فردوس کا منظر پیش کر رہے ہیں۔
اس منظر تخیل فرسا کے اندر جو بجائے قیام کا رہنما ہوئے کے بہشتِ غنہ اور نظر آتا ہے، عظیم
اپنے دل میں خیال کرتا ہے۔

کیا یہی وہ طریقہ ہے جس کے ذریعہ سے، انسان کی روح دنیا کی مصیبتوں سے آزاد
ہوگی؟ کیا یہی وہ تعلیم ہے کہ اس زندگی میں پاک لوگوں کے لئے کوئی راحت
نہیں، سوائے اس راحت کے جو نیک اعمالی سے اس کی روح کو حاصل ہوا اور
مرنے کے بعد اس کا نام روشن ہو کر دوسروں کے لئے نشانِ ہدایت اور شہرت کی
بلندیوں پر روشن و منور ہو؟

اے شریفانہ جذبات اور شجاعتانہ افکار کے پیکر حسین! جو کچھ تجھ سے کہا گیا ہے، یہاں اُسے
تلاش نہ کر! یہاں تو اس عیشِ مکروہ کے بہانہ سے تیری آزادی کے قوائے مقدس کو مفلوج کے
جانے کی تدبیریں ہو رہی ہیں۔ جس چیز نے قیدیانِ حریت و صداقت سے وہ غیر فانی کا زمانہ کر کے
جن سے آج دنیا روشن ہے، وہ اس نشاطِ انحطاط آفریں کا اثر نہ تھا، بلکہ وہ جفاکشی، پرہیزگاری
اور نیک خصلتی کا نتیجہ تھا۔ اس لئے وہ یقیناً ایک پیغمبرِ صادق نہیں ہو سکتا جو اپنے مقصدِ وحید
مقدس کو دنیا کے فانی جاہ و حشم سے آلودہ کر دے!

میں جانتا ہوں کہ مقنع مجھے ایک کمزور و ناتواں انسان تصور کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ
عیش و طرب کی یہ نمائشیں مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیں گی۔ ہاں اے مقنع کی روشنیوں،
چمکو اور اپنی پوری طاقتوں کے ساتھ چمکو! میری فطرت کو تم خیرہ نہیں کر سکتیں اور وہ
تمہارا مقابلہ کرے گی۔

یہ خیالات تھے جو عظیم کے دل و دماغ کے سامنے آنے والے تھے۔ لیکن
باہمہ اسکی ہر سحر ہوئی جا رہی ہے، لعل و بخور کا تنفس ایک بیسٹاروح کی طرح فضا پر حاوی
ہے، فواروں کے خاموش نغمے شہد کی مکھیوں کے اُن خواب آور گیتوں کا اثر رکھتے ہیں، جو نکست بار
پھولوں کے گرد ہجوم کر کے اس کے غنچوں کے عمق میں گاتی گاتی سو جاتی ہیں۔ وسیقی اور دور کی موسیقی

(یعنی اک دریا کے ترنم) کسی مخفی مقام سے اک موج نغمہ پیدا کر رہی ہے۔ الغرض یہ سب کچھ اسکی طاقت برداشت سے بہت زیادہ ہے اور اس تعطر میں اس قدر نشاط و سکون پنہاں ہے کہ وہ دل، جو اس طلسم روح پرور سے سحرور ہو جائے، شاید دنیا کی کسی شے کا احساس نہیں کر سکتا ہے۔

عظیم اپنے نرم و نازک حیات کے ساتھ ایک صندلی تخت پر بیٹھ جاتا ہے اور اپنے حواس کو اس شیریں ماحول کے سپرد کر دیتا ہے۔ جس طرح طوفان کے بعد سطحِ بحر پر موجیں نزاکت و سکون کے ساتھ ایک دوسرے پر آ کر ٹوٹتی ہیں، اسی طرح عظیم کے بحرِ تخیل پر زلیخا کے یاد کی موجیں آ کر ٹوٹنے لگیں۔ وہ اس زمانہ کی یاد کرتا ہے، جب یہ دونوں ایک دوسرے کی نگاہوں میں ڈوب ڈوب جاتے تھے، اور سکوتِ مسرور میں اس حد تک محو رہتے تھے کہ گویا اس عالم میں خدا نے اور کوئی شے پیدا ہی نہیں کی، یا تمام کائنات ان ہی کی نگاہوں میں سما گئی ہے۔

زلیخا، میری پیاری زلیخا! تیری یاد اس وقت بھی میری ہمدم ہے۔ تیری روح مجھ میں اب بھی ساری ہے۔ میں جہاں کہیں بھی ہوں تیرا ہوں، اور صرف تیرے لئے ہوں۔ میں اگر ناموری چاہتا ہوں تو صرف اسلئے کہ وہ تیرے رونقِ عذار کی وجہ ہو سکے، اگر کامیابی و کامرانی چاہتا ہوں تو محض اسلئے کہ وہ تیری تابشِ حسن کا باعث ہو سکے۔ میں تیری محبت افشاں نظروں میں اپنی جانفشانیوں کی داد پڑھ لینے کی تمنا رکھتا ہوں۔ میں اگر تیرے ایک تبسمِ زیر لب سے شاد کام ہو جاؤں تو اس لمحہ مختصر کو حیاتِ جاوید سے بیش قیمت سمجھوں گا۔ میں حیران ہوتا ہوں کہ جب میں تجھے پھر پاؤں گا اور تیرا پسلاؤ (جہاں میں اس وقت بھی حکمراں ہوں) میری گرمیِ قلب کا باعث ہو سکے گا تو میں اس مسرت کا تحمل کیونکر کروں گا؟ ہر چند میں اس لطف و محبت کے قابل نہیں، کیونکہ اس حالت و کیفیت کا مستحق تو ایک بہترین انسان کو ہونا چاہیے۔ آہ، یاد آیا! وہ ساعت جب میں نے تیرے نازک ہونٹوں کا رخصتی بوسہ لیا تھا! میں پھر ایک لذیذ بوسے سے اُن آنسوؤں کو خشک کروں گا، جنہیں صرف تیری ہی روح جاری کر سکتی ہے اور اُن آنسوؤں میں وہی حرارت محسوس کروں گا جو آنکھ سے نکلتے وقت پیدا ہوتی ہے۔ اُن جب میں اس وقت کو یاد کرتا ہوں تو میرا دل ٹرپ کر رہ جاتا ہے۔

عظیم، اپنے اس فردوس خیال کے سیر میں مجھ ہے اور تھوڑی دیر بعد، اس نغمہ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، جسکا سرسبز فاصلہ کی اثر آفرینی سے سلسلہ سحر کی ایک کڑی معلوم ہوتا ہے۔ پھر وہ آوازوں کی سمت مڑتا ہے، اور بیشمار قمقموں کی طویل قطاریں جس طرح ایک شفاف چشمہ پر انعکاس شفق ہوتا ہے (ایک دریا کے نور و بجلی رواں دیکھتا ہے۔ حد نظر پر پریوں کی ایک قطار اسے نظر آتی ہے اور وہ اس کی جانب بڑھتا ہے۔ اس انبوه لطافت میں بعض پریاں، جنہیں پھولوں کی زنجیر سے باہم وابستہ کر دیا گیا ہے، بیچ و خم کے ساتھ رقص میں مصروف ہیں، اور بعض آزاد و غیر پابند ہو کر حلقہ رقص کے گرد چکر لگا رہی ہیں؛ گویا پروانوں نے شمع کے گرد ہجوم کر رکھا ہے۔ جنگ ورباب کی موسیقی اور ان کے نغمہ ہائے مسکریں گم ہو جانے والے عظیم کی آنکھوں کے سامنے، پریوں کا قریب تر آنا اور پھر دور ہٹ ہٹ جانا، وہ منظر ہے، جس کی کوئی تاویل نہیں ہو سکتی ہے۔ وہ اس منظر لطیف میں غرق ہے کہ دفعۃً پریوں نے اپنی موسیقی بند کر دی اور ان کا ہجوم اس طرح منتشر ہو گیا، جس طرح خورشید کے گرد گلابی بادلوں کے ٹکڑے شام کے وقت پھیل جاتے ہیں؛ البتہ اس ہجوم میں ایک رعشہ ناک دوشیزہ پیچھے رہ گئی۔ ہر خندہ وہ اپنے ساتھ کی پریوں سے لوٹ آنے کی درخواست کرتی ہے، مگر کوئی اسکی تعمیل نہیں کرتا؛ اور اس خاورستان میں وہ تنہا رہ جاتی ہے۔ گویا اسکے چہرہ پر کوئی نقاب نہیں ہے مگر شیراز کی لڑکیوں کی وضع پر ایک نہایت سبک و مرصع جھومر اس کے گیسوؤں اور کافوری پیشانی کے ایک حصہ کو چھپائے ہوئے ہے۔ زلیخا اس حالت میں کشتش محترزانہ کی تصویر بنی ہوئی ہے۔ اسکے ایک ہاتھ میں صندوقی رباب ہے، جسپر ہاتھی دانت اور سونے کا کام ہے، اور خود وہ ایک سعی مضطرب ہو کر تاروں کو چھوتی اور پھر اپنی مرتعش انگلیوں کو ہٹا لیتی ہے۔ ایک اچھٹی ہوئی نظر، اک خطا کہربائی، عظیم کے چہرہ پر ڈالتی ہے اور ایک مطالعہ گریز یا سے کچھ مطمئن ہو جاتی ہے۔ کچھ دیر بعد وہ غزال نیم وحشی کے مانند اک جھجک کے ساتھ آگے بڑھتی ہے اور کاشانی مسند پر بیٹھ کر رباب کے تاروں کو چھیڑتی ہے اور یوں نغمہ ریز ہو جاتی ہے۔

گلاب کے اس کنج میں جہاں تمام تمام دن اور تمام تمام رات بلبل نغمہ سرائی کرتی رہتی تھی، ایام طفلی میں پھولوں سے لدی ہوئی ڈالیوں میں چھپ کر بلبل کے گیت سنتا، اب ایک خواب سا معلوم ہوتا ہے۔ آہ اس کنج کی نغمہ آفرینیاں مجھے کہی فراموش نہیں ہو سکتیں۔

جب موسم اپنے شباب پر ہوتا ہے، تو میں اکثر سوچا کرتی ہوں کہ آیا وہ بلبل، اس کنج میں

اب بھی مصروفِ ترنم ہے یا نہیں؟ آیا اس وقت بھی رود بند میر کے کنارے اسی طرح
تاہناک و ساکن ہیں؟ مگر پھر سوچتی ہوں کہ امواجِ دریا پردہ جھکی ہوئی شاخسائے گل کیونکر
نرمودہ ہونے سے بچی ہوں گی، جن کے نوزائیدہ غنچے ہم چن لیا کرتے تھے اور ان کے قطراتِ
قشنبہ، پنکھڑیوں سے پنچور کر زمین پر ڈال دیا کرتے تھے؟

ماضی کی یاد سے، انکے فنا ہو جانے سے قبل، میں مسرت حاصل کر نیکی کو شش کرتی ہوں۔ وہ ماضی
جس نے میری روح کو منور کیا تھا، اور جس کی یاد شاید ہمیشہ میرے خیال کی نگاہوں کو منور
بنائے رکھے گی۔ کیا وہ کبج اب بھی رود بند میر کے کنارے آباد ہے؟

غریب لڑکی، اگر میرے پاس تو اسلئے بھی گئی ہے کہ اپنے حسن کی تابناکیوں اور اپنی
موسیقی کی لطافتِ باریوں سے میرے دل کو غیر مقدس خواہشات سے لبریز کر دے،

تو تجھے معلوم ہونا چاہیئے کہ حقیقتاً تو اس فن سے بے بہرہ ہے۔ اوریوں بھی، ہر چند تیرے
پنکھڑی سے لب مجبور ہیں کہ وہ اپنی جنبش کو ایک غلط راستہ کی دعوت پر صرف کریں،
مگر تیری عصمت بار آنکھیں اس نغمہ فریب کار کی ہم آہنگ نہیں ہو سکتیں، وہ اس وقت
بھی اس کی تردید کر رہی ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ تیرا نغمہ، عہدِ شباب کے پاکیزہ ترین

جذبات کا حامل ہے، اور مجھے اس فضا کے معصوم میں کہنیچے لئے جاتا ہے، جہاں خیال
معصیت کے لئے انسانی دماغ تنگ ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسلئے میں اپنا فرض تصور کرتا
ہوں، کہ اس سے قبل کہ تیری آرزوئیں جادہ پاکیزگی سے منحرف ہوں، اے قمری
لطافت! میں تیرے قفس کی تیلیاں توڑ دوں اور تو پھر چمنِ محبت کی فضا میں

سیرایا پروازِ بنجائے،

عظیم، منور اس خیال کی انتہا پر نہ پہنچا تھا کہ ایک جانب لا جو ردی پردہ، حرکت میں آتا ہو
اور نہایت آہستگی کے ساتھ کھل کر بے شمار آنکھیں، شام کے نیلیں آسمان میں طلوعِ انجم کی طرح، خنداں
نظر آتی ہیں۔

پردہ جب پورا اٹھ جاتا ہے اور کنواریاں (پرستان کے معلق نثرن زار میں رہنے والیوں کی طرح)،
خوش و منتبہ، نمودار ہو جاتی ہیں، تو نسیم کے فرحت بخش جنوں کوں کے ساتھ یا سمیں پہلوں کی بارش

شروع ہوتی ہے اور ایک لطیف و رفیقِ رقص، جسکا تعلق فرش سے نہیں بلکہ فضا سے معلوم ہوتا ہے، شروع ہو جاتا ہے۔

زلیخا، اس ہنگامہ رقص و موسیقی کو دیکھ کر اپنا بدن چراتی ہوئی اس طرح اٹھ جاتی ہے جس طرح صبح بہاراں کی شعاع آفتاب سے متاثر ہو کر بنفشہ کے پھول سمٹنے لگتے ہیں۔ عظیم دور ہی سے ایک آہ سرد کے ساتھ اسکی مشائعت کرتا ہے لیکن قریب جا کر اسکو دیکھنا گوارا نہیں کرتا کہ مبادا اس کی نگاہیں اس کے حسن کو میلانہ کر دیں۔

رقص کرنوالی کنواریاں رقص کر رہی ہیں، انکی گردنیں گویا مینائے مرمرین ہیں، جن کے اندر شراب ارغوانی بھری ہوئی ہے اور ان پر مشرقی جواہر کی زیبائش، یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہولوں کے ہار کسی آبگینہ رنگین پر ڈال دیئے گئے ہیں۔ ان کے رقص کا ہر دائرہ قوس قزح نظر آتا ہے اور انکی طلائی پازیبوں کے گونگروا اپنی آواز روح میں پیوست کئے دیتے ہیں۔

رقص، آخر کار ختم ہو جاتا ہے، ایک لڑکی دوسری کو اپنے آغوش میں لے لیتی ہے اور انکا سر ریح مگر خفی تنفس، پردوں سے گذر کر پھولوں کی نکہت میں مل جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد پھر ایک پر سکون چشمے کی طرح، موسیقی سیال جاذب سامعہ ہونے لگتی ہے، اور عظیم اس منظر تبسم و موسیقی، اس نظارہ رنگ گل سے، مضحک ہو جاتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس ہنگامہ میں، محسوسات کو تھوڑی سی آزادی دیدینا بھی، تباہی ہے، اسلئے وہ کھڑا ہو جاتا ہے اور دیواروں کی آرائش و زیبائش سے دل ہلانے لگتا ہے۔ نقاشی و مصوری کے ان مناظر کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے جو اسکے لئے بالکل نئے اور سخت حیرت انگیز تھے۔ وہ ایک تصویر دیکھتا ہے جس میں مصور نے اپنے موئے قلم کی تمام جاں بخش نزاکتوں کے ساتھ ظاہر کیا ہے کہ دامن نقاب، جلوہ بے محابا سے زیادہ دلکش اور نیم نگاہی نظارگی عریاں سے زیادہ مہلک ہوتی ہے۔ اسکے بعد اسے دوسری تصویر دکھائی پڑتی ہے۔ جس میں عزیر مصر کی بیوی زلیخا، جو شمش شوق میں اپنی آغوش کو لہیتی ہے اور عبرانی نوجوان اسکے شبابِ فتنہ زاسے بھاگتا اور مڑ مڑ کر دیکھتا جاتا ہے کہ کہیں وہ اس بلائے حسن سے قریب تر تو نہیں ہو گیا۔

مسرور نگاہوں کے ساتھ عظیم، ان تصویر ہی افسانوں کو پڑھتا ہوا ایک کٹر کی کے قریب پہنچ جاتا ہے، جہاں سے سکونِ ماہتاب میں وہ چین کا نظارہ کرتا ہے لیکن مسحوری خیال کے زیر اثر، وہ ایسا

محسوس کرتا ہے کہ شاید نسیم کے جھونکے منجمد ہو گئے ہیں اور نہر کی روانی بے جان۔ صدائے موسیقی اب بعید ہو جاتی ہے اور اس قدر نرم ہو کر اس تک پہنچتی ہے، گویا فضا نے اس غنا و موسیقی کے اندر سے وہ سب کچھ جذب کر لیا ہے جس کا تعلق تاثراتِ ارضی سے ہے اور اب وہ مطلقاً سماوی بن گئی ہے۔ ان کیفیتِ آفریں مناظر اور اس تاثرِ زرا عالم میں وہ اپنے ہجومِ جذبات سے بیتاب ہو کر اپنی حیاتِ عاشقہ کے خوابوں میں مستغرق ہو جاتا ہے۔

بے خبر سستی، خواب دیکھے جا، اور اس خوابِ نوشیں سے کہی بیدار نہو! کیونکہ تیری روح کیلئے یہ سب آخری فرصتِ لطف و مسرت ہے۔ اس وقت سے پہلے کہ تیری مسراتِ رویا تجھ سے چین لے جائیں، اپنے پیکرِ جذبات کو آغوشِ خیال میں لیکر، جس قدر لطف حاصل کر سکتا ہے، کر لے! اس تبسمِ زمی حیات کا خواب دیکھ لے، جس نے وقتِ وداعِ تیرے دل کو اپنی روشنی سے بہر دیا تھا، اُن آنسوؤں کی یاد کر لے جو جدائی کے وقت تیرے سامنے پیش کئے گئے تھے، اور جن کی پاکیزگی کو بہترین گوہرِ شاہوار ہی نہیں پہنچ سکتے۔ ہاں، اس تبسم و اشکِ فشانِ ہستی اور اس مکان و فضا کا تصور کر لے، جہاں وہ اس وقت بھی تنہائی و بکیسی کے ہجوم میں تیری منتظر ہے اور ایک تنہا جگہ گانے والے ستارہ کی طرح تیرے لئے سراپا انتظار بنی ہوئی ہے۔ آہ یہ تیرا خواب جس کی شیرینی و لطافت تیرے دل کی تنہا روشنی تھی، آج تباہ ہو نیا لا ہے اور ہمیشہ کے لئے معدوم!

موسیقی خاموش ہو جاتی ہے اور آوازِ نغمہ موقوف۔ دوشیزگانِ بزمِ آراخصت ہو جاتی ہیں اور عظیم ایک آہ جگر خراش سُنتا ہے، ایک گریہِ ملال اُسے اپنی جانب متوجہ کر لیتا ہے۔ مگر یہ کون ہو سکتا ہے؟ عظیم کے دردمند دل کیلئے صدمہ و حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہ جاتی، کہ اس عشرتِ آباد میں غم و محن، رنج و مصیبت کیونکر بار بار پاسکتے ہیں؟ وہ ہچکیوں اور سسکیوں کی جانب بڑھتا ہے اور دیکھتا ہے کہ ایک گوشہ میں ایک نقاب پوشِ نازنین، دیوار کے سہارے کھڑی ہے۔ اس تصویرِ غم کا لباس نیلگوں ہے۔ جیسے بخارا کی عورتیں کسی عزیز کی مفارقت یا موت کے وقت پہنتی ہیں۔ اس خیال کے آتے ہی وہ تمام کیفیاتِ پیشِ نظر ہو گئیں، جن سے وقتِ وداع، زلیخا کا دل بھرا ہوا تھا اور جب اسکی آواز بند ہو کر صرف گرم گرم آنسو جذبات کا اظہار کر رہے تھے۔

اسکے جذبات میں ایک تلاطم پیدا ہو جاتا ہے اور وہ ایک عالمِ بخودی میں اپنی آغوشِ کنول دیتا

ہے وہ زار و زار لڑکی ہی عشق کی پذیرائی کیلئے بڑھتی ہے، مگر قبل اسکے کہ وہ عظیم کی آغوش تک پہنچے اس پر غش طاری ہو جاتا ہے، اور بیہوش ہو کر گر پڑتی ہے۔ نقاب سرک جاتا ہے اور عظیم جمالِ زلیخا کا نظارہ کرتا ہے۔ زلیخا کی حالت استغدر بدلی ہوئی تھی، کہ سوائے عظیم کے کوئی دوسرا اسکو پہچان بھی نہ سکتا تھا۔ وہ چند لمحے کے لئے شک و شبہ کی تصویر بن جاتا ہے، پہرا سکا سر اپنے زانو پر رکھ کر پیشانی سے حلقہ ہائے گیسو مٹاتا ہے۔ اسکی بند آنکھوں کے گرد سیاہ حلقوں کا مشاہدہ کرتا ہے، وہ اپنی زلیخا کو دیکھتا ہے، اس زلیخا کو، جسکی یاد میں اس نے اتنا زمانہ بسر کر دیا ہے، اور جس کے مسرت و ملال دونوں حالتوں میں اس کے لئے ایک جاذبیت، ایک کشش ہوا کرتی تھی۔

عظیم :- زلیخا میری پیاری زلیخا، اپنی آنکھیں کھول، ایک مختصر لمحہ کیلئے اپنی روح کے اُن غروں میں مجھے وہ نشانِ تلمطف دیکھ لینے دے، جس سے میری بیتاب محبت کو تسکین ہوا کرتی تھی۔ عظیم پر اپنی نگاہ لطف پرور کی جنتوں کے دروازے کھول دے۔ کیسا مبارک ٹھادہ ذریعہ و سبب جو تیرے یہاں ہو نچنے کا حیلہ ہوا! اگر دنیا کی تمام نعمتیں فراہم کر دیجائیں اور مجھے اختیارِ انتخاب ملے، تو اے میری پیاری! میری نگاہ انتخاب صرف تجھ ہی پر پڑ سکتی ہے، اور اسوقت میں ہی باور کر رہا ہوں کہ تمام عالم کی نعمتیں مجھے دیدی گئیں ہیں۔ کیونکہ آج میں پھر اپنی زلیخا، تمثالِ لطافت اور پیکرِ عصمت زلیخا کو اپنے پہلوئے شوق میں دیکھ رہا ہوں۔

عظیم کا ایک بوسہ جو اثراتِ کهربائی سے لبریز تھا، زلیخا کی آنکھوں کو مس کرتا ہے اور زلیخا کی آنکھیں اس طرح کھل جاتی ہیں، جیسے برف، ہوا کے اثر سے آہستہ آہستہ پگھل کر اپنے نیچے دبے ہوئے نیلگوں رنگ کے پہلوؤں کو نمایاں کر دیتی ہے۔ اسکی نظریں عظیم کی آنکھوں میں ڈوبتی چلی جا رہی ہیں، لیکن اُن میں بے چینی و وحشت ہے۔ وہ بیتاب و مضطرب ہے، اور اسکا سارا جسم عظیم کی آغوش میں ایک مستقل لرزش بنا ہوا ہے۔ آخر کار وہ اپنے تئیں، اُس کی گود سے نکال لیتی ہے اور ایک دروند چنچ کے ساتھ دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ اس طرح چپا لیتی ہے، گویا اسکی زندگی کی تمام لغزشیں چہرہ پر منقوش ہیں، جنہیں وہ کسی کو دکھانا نہیں چاہتی۔

زلیخا کی چال اور اسکی چنچ کے ساتھ اس جگہ کے تمام مناظر و حالات دفعتاً عظیم کے ذہن و دماغ

پرستولی ہو جاتے ہیں، اور مرگِ ناگہانی کی طرح اس کے لبرز شوقِ دل کو سرد کر دیتے ہیں۔ اب ہر چیز اس کے سامنے آئینہ ہو جاتی ہے اور وہ محسوس کرتا ہے کہ صحیح معنی میں اس کی زندگی کی تباہی آج ہی سے شروع ہوتی ہے۔

زلیخا:۔ آہ عظیم! ہر چند میں اپنے تئیں برباد کر چکی ہوں، مگر یہ یقین نہ کرو کہ کذبِ معصیت مجھے اپنی طرف راغب کر سکتے ہیں نہیں بلکہ میرے مفتوح ہو نیک سبب میرا ناقابلِ برداشت اندوہِ عالم تھا، جس نے مجھے دیوانہ کر دیا تھا۔ اگرچہ میں جانتی ہوں کہ تمہارے دل میں میری محبت کے لئے اب کوئی جگہ باقی نہ رہنی چاہیئے، لیکن میرے کہنے کا اس قدر ضرور یقین کرو کہ مجھ میں ایک ذرہ عقل و حواس باقی رہنے تک بھی، دنیا میں کوئی شے مجھے تم سے منحرف نہیں کر سکتی۔ مجھ سے تو کہا گیا تھا کہ تم مارے گئے! کاش ہم دونوں کے جدا ہوتے وقت مجھے برقِ صاعقہ بار نے جلا کر خاکستر کر دیا ہوتا! کاش تم جان سکتے، تمہیں یقین آسکتا کہ میں نے آیامِ مفارقت کس طرح سیلِ اشک بہا بہا کر بسر کئے ہیں! گویا درازی ہجراں ایک درخت تھی، جسکی آبیاری میں نے اپنے آنسوؤں سے کی تھی۔ اس طویلِ جدائی کا ایک ایک لمحہ میں نے صرف ایک تمہارے خیال میں بسر کیا ہے؛ اور صرف تمہارے خیال کی بار بار میں نے اس قدر تکرار کی کہ وہ بھی آخر کار درد و کرب بن گیا ہو اور مفارقت سے سرد ہو جائے والا دل اس پارِ برق کی مثال تھا۔ جو قطرہ قطرہ ہو کر بہ جاتا ہے۔ کاش تم دیکھ سکتے کہ میں دروازہ پر کھڑی رہ رہ کر تمہارے انتظار میں کتنی صبحوں کو شام تک پہنچایا ہے، راتوں کی طویل گھڑیاں بجم ورجا کی جاں گسل کشمکش میں کس طرح آنکھوں ہی آنکھوں میں گزار دی ہیں؛ کیونکہ میرے کانوں میں تو تمہاری آواز قدم بہ قدم وقت گونجا کرتی تھی! خدایا، تو واقف حال ہے کہ جب لشکرِ غم میرے دل کی آبادی اور میری امیدوں کو بے رحمی کے ساتھ زیر و زبر کر رہا تھا، جب ”عظیم مارا گیا“ کی دلخراش آواز نے میرے حواس کو معطل کر دیا تھا، اس وقت دنیا و آسمان کی تمام روشنیوں میں ایک جہلک بھی میری نظر کے لئے نہ رہ گئی تھی اور ساری دنیا کی مصیبت میری جاں گداز تکلیف کا نصف ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ عظیم غم مجھے رحم کی نگاہوں سے دیکھتے ہو، ہاں میں جانتی تھی کہ میرے حالِ زار کا فسانہ المناک

تمہارے دل کو ضرور نرم کر دے گا۔ اور تمہارا رنج و غصہ افسوس و ترحم سے بدل جائیگا۔
وہ مکار و دغا باز، جو مجھے دھوکا دیکر یہاں لے آیا، اسے مجھ سے ایسے قصے بیان کئے کہ اگر
میری جگہ فرشتہ ہوتا تو وہ بھی اس کے دام فریب میں آجاتا۔ اور اس کے مکر عظیم سے
بچنا محال ہوتا۔ اسنے مجھ سے کہا کہ میں ابدی نور کی فضا میں تم سے مل سکوں گی، ہمیشہ تم میرے
آنکھوں کے سامنے رہو گے اور میں تمہارے کوثر نگاہ سے جبرے کش مسرت ہوتی رہوں گی؛ لیکن
اس پر سکون زندگی کی مستحق وہی مقبول و برگزیدہ ہستیاں ہو سکیں گی، جو اس عالم میں متفنع
کی خدمت کر سکیں۔ سوچو، غور کرو، کہ میرے لئے یہ کس قدر دیوانگی فزا امید تھی۔ تم میری
حالت پر روتے ہو، آنسو بہاتے ہو! ہاں بہاؤ اور ضرور بہاؤ! کاش میں ان آنسوؤں کو
اپنے بوسوں سے خشک کر سکتی۔ مگر نہیں، میرے ناپاک لب تمہاری مقدس سانس
کو نہیں چھو سکتے۔ میرے لئے وہ ایک لمحہ خود فراموشی، جو کبھی تمہاری آغوش محبت
میں حاصل ہوا تھا، کافی ہے میں اسکی قدر کروں گی اور آخری سانس تک میری روح
اسی کی پرستش میں مشغول رہے گی۔ یہ یاد میرے دور خوش کامی کا آخری تبرک ہوگا، اس
وسیع سمندر کا ایک قطرہ شیریں ہوگا، جو اب بالکل خشک ہو چکا ہے۔ مگر اب تمہیں
یہاں سے جلد چلا جانا چاہیئے اور ہمیشہ کیلئے رخصت۔ یہ مقام تمہارے مقدس قدموں کے
قابل نہیں ہے۔ میں نے اپنی تباہیوں کا ابھی نصف بیان ہی نہیں سنا ہے، اتنا
سمجھ لو کہ یہاں معصیت کی حکومت ہے اور ہماری روحوں کے درمیان بد نصیبی کا ایک
ایسا طوفان حائل ہے جسکی تاریکی مجھے تمہاری ہستی سے اسی طرح علیحدہ کر رہی ہے جس
طرح جنت سے دوزخ؛

عظیم: زلیخا! زلیخا! عرش پاک کی قسم اگر باب اجابت ہنوز مسدود نہیں ہو گیا ہے، تو یقیناً
تیری نغز شیں نظر انداز کیجائیں گی اور تیری خطائیں بخش دی جائیں گی؛ تیرے محسوسات
کی معصومی اور تیرا انفعال قلبی، تیری نجات کے ضامن ہیں۔ محبت کی اس مقدس
روشنی کی قسم، جو ہم دونوں کی روحوں کے مزار پر اب بھی عکس فگن ہے، اور جو تیرے
دل میں یہاں کی آنسو دگیوں کی کثرت سے اور دل میں مایوسیوں کے طوفان سے بھی

فسردہ نہیں ہو چکی ہے، ہر خند کہ اس فضا کے مکروہ و کشف نے تجھ پر غلبہ حاصل کر لیا ہے، لیکن تو نجات حاصل کر گئی۔ اس لئے تم میرے ساتھ چلو اور اس پاک زمین کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دو۔

زلیخا:- میں تمہارے ساتھ چلوں! تم مجھے ہمراہ لیچلو گے! خداوند! کیا میں اتنی خوش قسمت ہو سکتی ہوں؟ آہ، یہ مسرت تو ایک طویل عمر کی اذیت و صعوبت کے معاوضہ سے بہت زیادہ ہے۔ پیارے عظیم سج کہو، کیا تم مجھے، ایک تباہ کار مہستی کو اپنے ہمراہ لے چلو گے؟ اپنے دلنواز پہلو میں جگہ دو گے؟ اور کیا یہ ممکن ہے کہ وہ لمحات تاثر و کیفیت، جن میں ہم دونوں اس قدر خوش اور آسودہ رہ چکے ہیں، پھر واپس مل جائیں گے؟ آہ، اگر یہ خواب ہے تو ایسا خواب ہے، جس میں جنتوں کی طمانیت پنہاں ہے، اور ایسی نوشدارو ہے جو مدتوں کے مردہ دلوں کو حیات تازہ بخش سکتی ہو۔ تمہارا قرب محبت پرور، اب مجھے ہمیشہ حاصل رہیگا، ان ہونٹوں کے ملکوتی نغمے ہر وقت میرے لئے نوازش سامعہ ہوتے رہیں گے، یہ محبت پاش نگاہیں ہر لحظہ میری روح کو اپنی شرابوں سے سرشار کرتی رہیں گی، اور حسیطرح داغدار چادر، سورج کی روشنی میں سفید ہی معلوم ہوتی ہے، اس حسیطرح تم اپنی پاکیزگیوں کو میرے اوپر منعکس کرتے رہو گے! غروب آفتاب کے وقت جبکہ خاطر و فخرم ضمیر پر گناہ کی یاد اپنی پوری طاقتوں کے ساتھ یورش کرے گی، تو تم اپنی لبریز اشک، پیاری پیاری آنکھیں آسمانوں کی جانب اٹھاؤ گے اور اپنی زلیخا کے حق میں دعائیں مانگو گے اور میں ہی اپنی ضعیف و خطا کار نگاہوں کو اسی نقطہ پر جمادیا کرونگی، یہاں تک کہ رحمت خداوندی کیلئے، ایک پیکرِ غم کا دل گرفتگی کے ساتھ ہر وقت تمہارے پہلو سے لگے رہنے کا نظارہ ناقابلِ برداشت ہو جائیگا، اور فرشتہ رحمت پیامِ عفو اور مژدہ نجات لائے گا!

ہنوز زلیخا کی گفتگو ختم نہ ہونے پائی تھی کہ کسی طرف سے آواز آئی، "اپنی قسم کو یاد کر! اپنی قسم کو یاد کر!! زلیخا کی رگوں میں جو خون، ابھی ابھی متحرک ہو گیا تھا اس آواز سے زرد رنگ میں تبدیل ہو گیا اور نہایت ضعیف و مردہ آواز میں اس نے عظیم سے کہا۔

یہ اسی کی آواز ہے، یہ وہی ہے اور میں اسی کی ہوں۔ بس اب سب کچھ ختم ہو گیا۔ تم یہاں سے

اپنی جان بچا کر نکل جاؤ، ورنہ تم ہی تباہ و برباد کر دیئے جاؤ گے۔ آہ، خدایا، میری قسم، ہاں یہ سچ ہے کہ میں مقنع کی منکوحہ ہوں اور ہمیشہ کے لئے اسکی ہو چکی ہوں جسوقت میں نے یہ منحوس قسم کھائی تھی، مردوں کی روحیں وہاں شہادت کیلئے آئی تھیں۔ اور میری قسم کو ان کے نیلے ہونٹوں نے دہرایا تھا۔ میں اسوقت بھی وہی خوفناک آوازیں سن رہی ہوں، انکی انکھیں میرے سامنے چمک رہی ہیں۔ جب میں نے پیمانہ عہد کو منہ سے لگایا تھا، تو میں نے محسوس کیا تھا کہ کوئلے ہوئے خون کا ایک گھونٹ میرے حلق سے اتر رہا ہے۔ اسکا اثر اس وقت بھی میری زبان پر ہے۔ آج رات کو میں نے اپنے نقاب پوش شوہر کی شکل بھی دیکھی۔ خدا ہی خوب جانتا ہے کہ اسنے اسکی شکل سے زیادہ کریہ اور خوف آفریں صورت کوئی اور بھی بنائی ہے یا نہیں۔ اب میں یہاں سے جاتی ہوں۔ کیونکہ میں نہ تو تمہاری ہو سکتی ہوں اور نہ خدا کی، نہ محبت کی ہوں اور نہ کسی ایسی چیز کی جو مقدس ہے۔ آہ تم مجھے اپنی آغوش میں مضبوطی کے ساتھ لئے لیتے ہو، مگر شاید نہیں جانتے کہ جو شیطان، دلوں میں تفریق پیدا کر سکتا ہے وہ ہاتھوں کو بھی جدا کر سکتا ہے۔ اچھا پیار سے عظیم، خدا حافظ! ہمیشہ کیلئے خدا حافظ! اے

دیوانگی و جنون کی حالت میں کمزور بھی شہ زور ہو جاتے ہیں اور یہی دیوانگی کی طاقت تھی کہ زلیخا، عظیم کی گود سے نکل کر ایک پیچ کے ساتھ اس مقام سے بسرعت چلی جاتی ہے، اور نظروں سے پوشیدہ ہو جاتی ہے۔

شاہزادی لالہ رخ، زلیخا و عظیم کے عشق نامہ کام کی داستان اور الم نصیبی کے بیان سے اسقدر متاثر ہوئی کہ تمام دن، اسکا خیال اسی میں مصروف رہا۔ مسرت اندوزی کا جذبہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسکے پاس سے یکسر معدوم ہو گیا ہے اور وہ اسقدر انہماک میں ڈوبی ہوئی تھی کہ اسنے فضل الدین کی طرف آنکھ بھی نہ اٹھائی۔ اسنے ایک قسم کی بچین مسرت کے ساتھ اول مرتبہ یہ تصور کیا کہ عظیم بالکل فرامرز کی طرح ہو گیا۔ کاروان شاہی جسوقت ایک دور افتادہ ندی کے کنارے سے گزر رہا تھا، شاہزادی نے ایک ہندوہ و شیزہ کو دیکھا۔ اسکا نا وقت اس تنہا مقام پر ہونا شاہزادی کی حیرت کا باعث ہوا۔ قافلہ رگوبایا گیا اور اس نے دیکھنا چاہا کہ یہ لڑکی کیا کرتی ہے۔ ہندو لڑکی نے ایک چوٹا سا گہی کا چراغ روشن

کیا اور اُسے ایک تھالی میں رکھ کر ہولوں کے ہار سے آراستہ کیا۔ اس کے بعد کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے اسکو دریا کے لہروں کے سپرد کر کے، سخت بیم ورجا کی تصویر بنی ہوئی اسکی روانی کو دیکھتی رہی شاہی قافلہ کی شوکت و حشمت ہی اس لڑکی کی توجہ اپنے طرف مائل نہ کر سکی، جس سے لالہ رخ بھی متحیر اور متعجب ہوئی۔ خدام بارگاہ میں سے ایک شخص نے جو دریاے گنگ کے کسی ساحلی مقام کا باشندہ تھا، شاہزادی کے سامنے آکر بیان کیا کہ ہندو عورتوں میں یہ ایک رسم تفاؤل ہے جو کسی عزیز کی مراجعت و وطن یا اس کی خیر و عافیت کے متعلق اپنے شکوک و اوہام رفع کرنے کے لئے عمل میں لائی جاتی ہے۔ دریاے گنگ کے کناروں پر جہاں ہندو عورتیں اور لڑکیاں اس طرح شگون لیتی ہیں، یہ نظارہ اکثر اور کثرت کے ساتھ دیکھنے میں آتا ہے۔ اگر چراغ گل ہو جائے یا ڈوب جائے تو اسکو شگون بد سمجھا جاتا ہے، لیکن اگر وہ چراغ روشن رہ کر رہتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو جائے، تو پردیسی پریمی کی صحت و واپسی یقینی سمجھی جاتی ہے۔

قافلہ روانہ ہو گیا، مگر لالہ رخ، بار بار مڑ کر ہندو دوشیزہ کی شمع تفاؤل کو دیکھتی رہی اور حب آخری مرتبہ ہی اسے چراغ کو روشن دیکھا تو اس خوش فالی سے نہایت خوش ہوئی، کیونکہ وہ سمجھتی تھی کہ اس چراغ کی حفاظت پر ایک شباب آغاز دوشیزہ کی زندگی کا انحصار ہے اور محسوس کر رہی تھی کہ اس لڑکی کی امیدیں ہی اتنی ہی کمزور تھیں، جس قدر اس چراغ کا شعلہ منزل کا باقی حصہ نہایت خاموشی کے عالم میں طے ہو گیا۔ اور قافلہ منزل پر پہنچ گیا، لیکن اسوقت تک کہ شاہزادی کے بارگاہ جمال میں فرامرز کے تار ہائے برباب کی صدا پیدا نہ ہوئی، وہ اسی خیال میں منہمک رہی اور اسکے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں مسرت کی چمک پیدا ہو گئی۔ آخر کار فرامرز طلب کیا گیا، جس نے داستان کا باقی حصہ یوں شروع کیا:۔

(۶)

خلیفہ ہمدی، ہر چند یونانیوں کے ساتھ معرکہ آرا ہونے کے بعد یک گونہ خستہ ہو رہا تھا، اور نہیں چاہتا تھا کہ اسکی فوجیں فوراً ہی کسی جنگ میں مشغول ہو جائیں، لیکن ہر ساعت کی اطلاعات نے اسکے سامنے آنیوالے خطرات کو ایسی صورت میں پیش کیا کہ ابن مقفع کا استیصال اسکے نزدیک ضروری ہو گیا۔ چنانچہ خلیفہ نے، ان اطلاعات کے پہنچتے ہی عہد کیا کہ جب تک وہ اسلام کو اس خارج مدعی

نبوت کے فتنہ سے پاک نہ کر لیگا، آرام نہ لیگا۔ اور جسوقت تک وہ اس گروہِ مرتدین کو پسپا و منتشر نہ کر لیگا، عیش و مسرت کے خیال کو اپنے دل میں جگہ نہ دیگا۔

احکام جاری ہو جاتے ہیں، ایک مرتبہ ہر خلافت عباسیہ کے پرچم ہوا میں اہل رائے کیلئے کھول دئے جاتے ہیں، اور سپاہِ اسلام، اپنی تمام شوکت و سطوت کے ساتھ مقنن کی سرکوبی کیلئے روانہ ہو جاتی ہے۔ کل جن میدانوں میں زندگی کی علامت مفقود تھی، آثارِ حیات تھے، آج ایک شہرِ خیام نظر آ رہا ہے، اور عین وسط میں دربارِ خلافت کا قمری شامیانہ قائم ہے۔

اس اجتماع سے شور و غل اور قہقہوں کی صدائیں بلند ہو کر ہوا میں ملتی ہیں اور دور دور تک پہنچ رہی ہیں۔ کبھی فوجوں کے گھوڑوں کے منہانے کی آوازیں ہیں تو کبھی ساربانوں کی صدائیں مسنن میں آ جاتی ہیں، کبھی طبل جنگ کی موسیقی ضیافتِ سامعہ ہوتی ہے، تو کبھی حبشیوں کی بانسروں کے مدہم سر سامعہ نواز ہو رہے ہیں۔ غرض لشکرِ خلافت عجیب و غریب نظارہ پیش کر رہا ہے اور اسلحہ و سپاہ کی شان و عظمت کی یہ نمائش اپنے قسم کی نادر ترین نمائش ہے۔

اس طرف اگر لشکرِ اسلام، دنیا کی مختلف، شجاع ترین اقوام پر مشتمل ہے، تو دوسری جانب مقنن کی فوج بھی اتنی ہی تعداد میں ولایتِ ایران کے مشہور و منتخب جنگجو قبائل سے طیار ہوئی ہے، اور پروان مقنن کے علاوہ آتش پرستانِ فارس بھی اسکے شریک ہو گئے ہیں۔ صفیں آراستہ ہوتی ہیں اور حملہ کا آغاز ہو جاتا ہے۔ خلیفہ مہدی اگر اسلام کو ایک فتنہ ندہی سے پاک کر دینے کے بعد کی خوشی کے خیال سے سرور اور دستِ بدعلی ہے، تو مقنن بھی سمجھ رہا ہے کہ آج ہمیشہ کیلئے فیصلہ ہو جانا ہے، یا تو تمام عالم اسکے زیرِ نگیں ہو جاتا ہے یا اسکا کارگاہِ مذہب و تبلیغ ہی ہمیشہ کیلئے ختم ہوتا ہے۔

ایک جانب خلیفہ اسلام اپنے لشکر کو مخاطب کر کے کہہ رہا ہے ”بڑھے چلو، حق و صداقت کے علمدارو! کیونکہ شہیدوں کیلئے جنت، اور فاتحین کیلئے غازی کا درجہ ہے“ دوسری سمت مقنن پکار رہا ہے ”بڑھے چلو، انتقام کے حامی بہادرو، بڑھے چلو! نامردوں اور گمراہوں کیلئے شیطان کی غلامی اور بندگی ہے۔ لڑائی پوری قوت کیساتھ ہو رہی ہے۔ اور ایک سخت مقابلہ کے بعد سپاہِ خلافت کے پانوں اکھڑ جاتے ہیں۔ مقنن، خود خلیفہ کے پرچمِ شبِ رنگ کو اٹھا لیتا ہے اور اس یقین سے کہ اب مشرقِ اعظم اسکی ملکیت ہے، فخر و مباہات سے معمور ہو جاتا ہے۔ ہنوز وہ اس مسرت کے خیال سے کافی بہرہ اندوز نہیں ہونے

پاتا ہے، کہ شورِ حرب میں ایک غیر معمولی تبدیلی نظر آتی ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ یکا یک شکست خوردہ فوج اسلام کو کوئی روک دیتا ہے؛ وہ فوج پلٹ پڑتی ہے؛ اور ایک ناقابلِ مداخلت ہجوم کر کے حملہ آور ہوتی ہے۔ اس حملہ کا سپہ سالار اس وقت ایک نوجوان ہے، جو اپنی صورت کے لحاظ سے ایک فرشتہ آسمانی معلوم ہوتا ہے، اور شہامت کے آثار و علامات جو اسکے بشرہ کا جزو مستقل نظر آتے ہیں، اسکی روئیں تن ہونیکا یقین دلاتے ہیں۔ اسکا حملہ اسقدر سخت ہوتا ہے کہ متقنع کی فاتح فوج سپاہیوں نے لگتی ہے، ہر قدم پر جو آگے اٹھتا ہے، اس سپہ سالار کے چہرہ میں امید و جرات کی رنگینیاں بڑھتی جاتی ہیں اور ہر لمحہ میں اسے اپنی فتح کا یقین ہو رہا ہے متقنع، میدانِ کارزار کے وسط میں کھڑا ہے اور ہر خندق کو تشش مقابلہ کرتا ہے، مگر اسکی فوج، بادلوں کے ان ٹکڑوں کی طرح، جو دھندلے چاند کو تنہا چوڑ کر چلے جاتے ہیں، ہلاکی جارہی ہے۔ وہ پکارتا ہے مگر کوئی نہیں سنتا؛ وہ لعنتوں کی بارش کرتا ہے، ملامتوں کا دریا بہاتا ہے مگر کوئی کان نہیں دہرتا۔ اور آخر کار نہرِ میت خوردہ متقنع خود بھی جائے پناہ کی تلاش کرنے لگتا ہے۔

فوج اسلام میں معجزہ، کا شور مچ جاتا ہے۔ ہر تنفس کی نظریں نوجوان سپہ سالار پر جم جاتی ہیں، مگر وہ یہ کہ اسے اس دنیا سے حیرت اور عالمِ استعجاب کی پروا ہی نہیں؛ اور متقنع کے تعاقب میں بدحواس ہے، بچپن و مضطرب ہے۔ سپا شدہ فوج، متقنع کے سپاہی، اسکی تلوار کی زد میں ہیں، مگر انپر اسکا ہاتھ نہیں اٹھتا اور اسکے غصہ و غضب کا آتش فشاں مادہ صرف ایک متقنع کی ملعون ہستی کے لئے محفوظ ہے۔ لیکن باوجود سعی و جستجو وہ متقنع کو نہیں پاتا۔

باوجودیکہ متقنع کی فطرتِ درشت کے لئے فرار اختیار کرنا ماروا سا تھا، مگر وہ اپنی فوج کے ہجوم میں کچھ اس طرح گہرا ہوا ہے۔ کہ وہ اپنے تئیں، اس رحبتِ قہقری کے سیل میں قائم نہیں رہ سکتا۔ اور سب کے ساتھ بھاگنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ تاہم وہ اپنے غم و غصہ میں بلا تحقیق دوست و دشمن سیف آزمائی میں مصروف ہے۔ آخر کار اللہ اکبر کی تکبیریں بلند ہوتی ہیں اور محمد خلیفہ کی طرف سے اعلان ہوتا ہے کہ عسکرِ خلافت نے فتح پائی اور متقنع مفرور ہو گیا۔ جشنِ نصرت میں تمام لوگ حصہ لیتے ہیں۔ اور بازار اور راستے زرین بنادے جاتے ہیں۔ معبدِ منور کئے گئے ہیں، اور ہر طرف چراغاں ہو رہا ہے۔ مگر اس تمام شادمانی و نصرت میں، اس تمام ہجوم و انبوه میں ایک جذبہ اور بھی ہے جو باقی تمام جذبات سے قوی اور شدید ہے، اور وہ جذبہ رشک ہے۔ عظیم تختِ خلافت کے روبرو پیش ہوتا ہے۔ خلیفہ اسلام استحسان و پذیرائی کی تصویر بنا ہوا اس کے

اداسے آداب پر متبسم ہوتا ہے۔ اسکا نام ہزاروں زبانوں کا وظیفہ ہو جاتا ہے، اور لوگ اسکا نام لے لیکر مسرت و شادمانی کے نعرے بلند کرتے ہیں۔ مگر خود عظیم پر کوئی اثر نہیں ہے، وہ اسی طرح بے پردا و بے تعلق نظر آتا ہے، جس طرح قبل از جنگ دنیا نے اسے دیکھا تھا۔ اور وہ اسی قدر مغموں و مکدر رہا یا جاتا ہے۔

بد نصیب عظیم، تیرا بچ وہ بچ ہے، جسے نصرت و فحمت ہی کی مستری ہی زائل نہیں کر سکتیں۔ تیرا غم وہ غم ہے جسے ایسی صد ہا فتوحات ہی دفع نہیں کر سکتیں۔ تیرا الم حد امید سے گذر گیا ہے۔ منہا چارہ ساری اسکے بہت پیچھے رہ گیا ہے، اور تیرا علاج کی رسائی وہاں تک نہیں ہو سکتی۔ وہ ایک تاریکی ہے، ایک بار دسکون ہے، جس کو کوئی قوت روشن نہیں کر سکتی۔ دنیا میں اور بھی ایسے دل گذرے ہیں جن پر غم و اندوہ نے تدریج کے ساتھ قبضہ کیا، مگر تیرے اوپر تو، اسے شباب فنا گشتہ، کوہ غم کی شکستہ یکبارگی ہوئی، اور اس حالت میں جبکہ ہر جزیرہ تیری چشم شوق کے سامنے لطف و مسرت کا لباس پہنکر جلوہ آرا تھی، آرزوئیں اور امیدیں تیرے سامنے مسکرا رہی تھیں، ماضی نے عیش حال کا قالب اختیار کر لیا تھا، ٹھیک اسی وقت غم کا کوہ آتش فشاں پھٹ پڑا اور تیری آرزوؤں کو تو وہ خاکستر بنایا گیا، جذبات کے نشوونما کو پامال کر گیا! گویا وہ کسی فوارے کے قطرات تھے جو جبت و صعود سے قبل تو منجمد نظر آتے ہیں، لیکن اوپر پہنچ کر کچھ نہیں رہتے، مگر آوارگی و انتشار اور فرش پر گر جانے کے بعد صرف ایک سیل بیکار! عظیم کے قلب و جگر میں اب کچھ باقی نہیں، اس کے خون میں کوئی حرارت نہیں، مگر انتقام کی! اسکی نبض کی حرکت اب صرف اسی ایک خیال پر منحصر ہے، جسکے سہارے وہ زندہ ہے۔ وہ اس ذات سے، جس نے اسکی ہستی اور محبت کو تباہ کر دیا ہے، ایک سخت انتقام لینا چاہتا ہے۔ چنانچہ ہی جذبہ تھا کہ جب اسے خلیفہ کے لشکر کشی کی خبر ملی، تو ایک شکاری باز کی طرح میدانِ حرب میں چھپٹ کر پہنچا، کہ متعین سے بدلے اور جوق لشکر اسلام کیلئے کوئی امید باقی نہ رہی تھی، تو عظیم نے اپنے آپ کو اس آگ میں جھونک دیا اور ایک عالم کو فنا ہونے سے بچا لیا۔ اور انتقام ہی کیلئے وہ اس وقت بھی، فخر و مباہات، عزت و عظمت کے خیال سے بے پروا نظر آتا ہے۔ اب اگر کوئی خیال اسکی تنفس کی آمد و شد کا تنہا سہارا ہے تو صرف یہ کہ کسی طرح وہ برق سوزندہ کی ایک ٹرپ بن جائے، انتقام لے لے اور افسردہ ہو جائے۔

مقنع ایک مختصر گروہ کے ساتھ تھیں جو کو عبور کر کے مرد جا پہنچا ہے، اور اپنے گم کردہ تختِ عظمت پر آخری باز نگاہِ حسرت ڈال کر خشک و مستحکم ہو جاتا ہے۔ اور اپنا علمِ ابیض بلند کر کے پرالندہ جماعت کو فراہم کرتا، اور متعاقب فاتحین کا انتظار کرتا ہے۔

مقنع اپنے غنیہ زارِ شعریہ و موسیقیت کی تمام شیرینی میں صرف ایک ہستی کو منتخب کر کے اپنے ساتھ لایا تھا، اور وہ ہستی بد نصیب زلیخا کی تھی۔ اسکا یہ انتخاب حسن و جمال کی بنا پر نہ تھا، کیونکہ وہ تو اب اس کلی کی طرح تھی جو شام کی اُداسی میں شاخ سے گر کر پر مردہ ہو جاتی ہے، اور نہ یہ نگاہِ انتخاب بر بنائے محبت تھی، کیونکہ مقنع کے خار زار دل میں اس پاک جذبہ کا پایا جانا محال تھا، بلکہ زلیخا اسکا شکار تھی اور یہی سبب اسے منتخب ہونیکا تھا۔

رات نے تمام عالم کو تاریک بنا دیا ہے، اور سامنے کے وسیع میدانوں میں چراغاں کا سماں منظر ہے، گویا برسات میں کوئی کنج باغ سامنے کر دیا گیا ہے، جہاں بشمار جگنو جو سما میں منتشر ہیں۔ ان روشنیوں کے سامنے حملہ آور کا کمپ روشن ہے، جس کی قناتوں اور خمیوں کا وسیع و طویل سلسلہ منہائے افق تک چلا گیا ہے۔ مقنع اس شہرِ خیام کو دیکھتا ہے اور یہ خیال کر کے کہ ہر خیمہ میری قوت ایک حد تک پامال ہو چکی ہے، پہر ہی مجھے عمدہ برآہو نے کیلئے لاکھوں کا لشکر درکار ہے، مسکرا دیتا ہے۔

اس شیطان کی بددست سے، جسے شاہِ اسیر یا کی عظیم الشان فوج کو آن واحد میں تباہ کر دیا، میں اس لشکر کو بھی مٹا دوں گا اور آج رات کو دوزخ کے تمام اعماق اس فوج سے بھر دے جائیں گے، انجامِ کار تخت کا مالک پیغمبر ہو یا خلیفہ، بہر حال اس نوع انسان کو تباہ ہونا ہے اور میں اس نفرت انگیز دنیا کو مظلومیت کی چنج پکار سے آباد دیکھ سکوں گا! مقنع، اس طرح اپنے خبثِ باطن کو تسلی دیکر، اس مختصر جماعت پر نظر ڈالتا ہے، جو اسکے گرد موجود ہے اور اس سے مخاطب ہوتا ہے :-

”اُس آسمانی نور کے محافظو، جسکی روشنی نہ تو خون کے سمندرون سے اندپڑ سکتی ہے، اور نہ دنیا کی کوئی اور چیز اسے محاق میں لاسکتی ہے، یاد رکھو کہ اسکی تابش کے سامنے وہیم اکاسرہ اور جو اہر آبدار اسی طرح افسردہ ہو جاتے ہیں، جس طرح طلوعِ سحر کو وقتِ آسمان پر تارے۔ میرے بہادر و خوش ہو جاؤ کہ کامیابی ہمارے پیش نظر ہے، اور فتح و

ظفر ہماری کنیز۔ لوح مقدس پر، جسے فرشتوں کے سوا کوئی نہیں دیکھ سکتا یہ پیشین گوئی ثبت ہو چکی ہے کہ جس وقت نخشہ کے چاہ مقدس سے چاند طلوع کرے گا، اسلام کی حشمت کا شیرازہ منتشر ہو جائیگا۔ اور نظریں اٹھاؤ اور دیکھو!

پیروان مقنع نے اس جگہ کے ساتھ ہی نگاہیں اٹھائیں اور ایک عجیب و غریب روشنی کا طوفان چھایا ہوا دیکھا۔ چاند نخشہ سے ایک پورا چاند طلوع کر کے عروج پر پہنچتا ہے اور تمام آبادی و ویرانہ منور ہو جاتا ہے، تمام لوگ اس ساحرانہ نمائش سے مبہوت مرعوب ہو کر سیدے میں جھک جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ چاند ان کی ہریت پر رحم کہا کر آئندہ جنگ میں ان کی امداد کیلئے نیچے اتر آیا ہے۔ یہودیوں نے دیکھا اور یقین کر لیا کہ یہی وہ نور ہے جو موسیٰ کے لئے ظاہر ہوا تھا اور اب امت موسوی کی سلاسل غلامی کو توڑنے کے لئے روشن ہوا ہے۔

سار اگر وہ ہم آہنگ ہو کر نعرہ فتح بلند کرتا ہے۔ مقنع جو موقع کا انتخاب کرنے میں کامل ہے، فوراً شہر کے دروازے کھلوا دیتا ہے، اور مہمدی کے لشکرِ حملہ آور ہوتا ہے۔ لشکرِ اسلام کا طلائی گرد سوار، جو اپنے فرض منصبی کو فراموش کر کے اس مافوق الفطرت روشنی کے تماشے میں محو ہو گیا تھا، اپنے تنیں ایک آہنی بازو کی غیر متوقع گرفت میں پاتا ہے اور اس کی خوفناک پیچ کے ذریعہ سے خطرہ کی اطلاع لشکرِ اسلام کو ہو جاتی ہے۔

”بڑھے جلوہ دارو، اس روشنی کی سمت بڑھو، جو سامنے سراپردہ شاہی کو نمایاں کر رہی ہے۔ اپنی تلوار کو کو ادنیٰ درجہ کے خون سے بے آب نہ کرو، خلیفہ، تو اس قنات کے اندر مصروفِ راحت ہے۔ ورنہ خوش نصیب ہے، جس کا صرف ایک دارا اسکی حیات کو قطع کر سکے۔“

تلوار کے مقابلہ میں تلوار اور نیزہ کے جواب میں نیزہ بلند ہوتا شروع ہو جاتا ہے اور کمپ کی تیز روشنیوں میں سپاہِ اسلام شہد کی لکھیوں کی طرح آوازِ طبل کے ساتھ ہی اُمنڈ پڑتی ہے اور آخر کار ساری فوج اپنی پوری قوت کے ساتھ طیار ہو کر مقابلہ آرا ہو جاتی ہے۔ حملہ آور کو مجبور ہو کر پھر راہِ نخشہ اختیار کرنی پڑتی ہے مقنع کا نقرئی نقاب اس ہنگامہ میں کبھی کبھی اس طوفان زدہ کشتی کے بادبانوں کی طرح نظر آ جاتا ہے، جسے وقتاً فوقتاً طوفان ہی کی خفیف اور دھندلی روشنی بڑھ کر نمایاں کر دیتی ہے۔

لیکن کیا اس مغرور سہتی کا پندار، بالکل با مال ہو گیا ہے، کیا اسکے ابرو کے مغرور خم کو سیدھا اور اسکی

ختم نہ ہونیوالی جراتوں کو ضعیف کر دیا گیا ہے، نہیں، ہر خد کہ وہ بد نصیب، جنگ و شب گذشتہ اس نے فتح و کامرانی کا یقین کرادیا تھا نصف کے قریب تیرتین ہو چکے ہیں، لیکن اسوقت پھر وہ سب کو حکومت عزت حاصل ہونیکا یقین دلا رہا ہے اور وہ ہیں کہ اب بھی اسکی باتوں پر ایمان لائے ہوئے ہیں۔ ایک عاشق اُن نگاہوں کی طرف سے، جنہوں نے اسکا دل جرایا ہے بے اعتبار ہو سکتا ہے، ایک بچہ آسمانی قوس قزح کے ساتھ کیلئے کا خیال بھلا دے سکتا ہے، ایک کیمیا گراپنے بنائے ہوئے سونے پر شک کر سکتا ہے، لیکن اعتقاد، جب ایک دفعہ قائم ہو جاتا ہے تو متزلزل نہیں ہوتا اور اسکا استحکام اک طلسمی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

خراسانی خادع، تالیفِ قلوب کے اُن تمام طریقوں کا ماہر تھا، جو صرف عزازیل ہی کو معلوم ہیں، او اسلئے وہ آخر وقت تک ہمت نہیں ہارا، اور اپنی تمام تدابیر کے دوران میں اُس نے زلیخا کو فراموش نہیں ہونے دیا۔

بد نصیب زلیخا! اگر فہم و ادراک تیرے دماغ میں یکسر خوابیدہ نہ ہو جاتے، تو وہ خوفناک مناظر جو تیرے سامنے گذر رہے ہیں اسقدر تھے کہ تو انکا نصف حصہ ہی برداشت کرنے کیلئے زندہ نہ رہ سکتی، اور موت کا فرشتہ تیری روح کو مقام موعود پر پہنچا دیتا۔ لیکن ایسا نہ ہوا، کیونکہ تیرے خیال پر بلکہ خود تیری زندگی پر ایک قسم کا شک، ایک تعطل، ایک بے حسی (اُس خوفناک رات کے بعد سے، جبکہ تجھے ایک سخت روحانی جدوجہد کرنی پڑی تھی، طاری ہے۔ اور اسوقت سے تیرے امن و راحت کی آخری امید بھی تیرے پاس سے خست ہو گئی ہے۔ اگرچہ کبھی کبھی رشتہ جنوں نمودار ہونے کیلئے ایک ناکام کوشش کرتا رہا ہے، جیسے کہ وہ آتش فشاں اپنے اندر سے رقیق مادہ کو وقتاً فوقتاً لہروں کے ذریعہ سے باہر نکال کر پھینک دینے کیلئے آمادہ رہتا ہے، لیکن تو اسوقت بھی تعطل و بے حسی کی تصویر بنی رہی۔

مقنع کے حکم سے، زلیخا آج پہر اسی شانِ رعنائی سے سنواری جاتی ہے اور اسکے پسماندہ مریدوں میں شجہ عقیدت بڑھانے کیلئے لائی جانیوالی ہے، گویا وہ ایک ایسی دوشیزہ جمیل تھی جسے مصریانِ قدیم دلکش انداز میں بنا سجا کر دریائے نیل پر قربانی چڑھایا کرتے تھے۔

زلیخا اپنی قربانگاہ پر جانے سے قبل سر نیچا کئے کھڑی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ آذربستانِ یونان کا کوئی بت ہے جس میں خون کی جگہ رُخ و الم کا گہرا رنگ بہر دیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ مقنع کی فتنہ ساز یوں کا خزانہ ایک دن خالی ہو جائیگا، طلوعِ ماہِ کا معجزہ اسکے کیدِ عظیم کا آخری حربہ تھا، اور زنجی کے ذریعہ سے ہی وہ اب کسی کامیابی کا متوقع نہ ہو سکتا تھا۔ اس لئے اب مایوسی کی تاریکیاں اس پر غالب ہو گئیں، اور بے چین ہو کر وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ محاصرہ نے آگ کے شعلوں سے حملہ کیا اور رات کی تاریکی میں آتشباری شروع ہو گئی۔

اس طریقہ جنگ سے رات کے تھوڑے حصہ میں ہزاروں جانیں تلف ہو جاتی ہیں اور ان مقتولینِ آتش کی چیخوں سے ساری فضا نالہ و فغاں سے معمور ہو جاتی ہے، شہر اور آبادی کی حسین ترین عمارتیں اور انکی دلکش آرائشیں نذر آتش ہو رہی ہیں۔

ہر حید سے یقین ہو جاتا ہے کہ اب دنیا میں کوئی جائے پناہ نہیں رہ گئی، لیکن اپنی مستقل بے غیرتی کے ساتھ مریدوں سے کہتا ہے:-

اب کیا غور و تامل ہے؟ اب جبکہ ہم کامیابی کے دروازہ پر کھڑے ہیں، کیا پس پیش ہے؟ ہر چند قدرت نے ہماری جماعت کو قلیل و مختصر کر دیا ہے اور ان لوگوں کو ہم سے چین لیا ہے جو اسکی روشنیوں کو چمکانے کا سبب تھے، تاہم ہمیں بادشاہوں اور سلطنتوں کو تباہ کرنا ہے، کیا تم نے قدرت پر اعتقاد رکھنا چھوڑ دیا ہے، اس قدرت پر جو تمہاری روشنی اور تمہارا ستارہ ہے؟ کیا تم یہ یقین نہیں کرتے کہ تمہارے پیغمبر کی نگاہوں میں آسمانی بجلیاں چھپی ہوئی ہیں اور وہ چشمِ زدن میں اس حملہ آور فوج کو جلا کر خاکستر کر سکتا ہے؟ یاد رکھو کہ وہ بجلیاں جو اس وقت تک مستور تھیں، اب دنیا ان کا تماشا کر گئی۔ اور آج کی شب میرے برگزیدہ مریدو! تمہاری خستہ و در ماندہ روحوں کیلئے وہ سامانِ اکل و شرب مہیا کیا جائیگا، جو گروہِ بیاں عرش کی غذا ہے، جو تمہارے اندر تمہاری روحوں کو نئی زندگی سے معمور کر دے گا۔ تمہارے واسطے بادۂ احمر فراہم کی جائے گی، جو یہ چشمِ حوران بہشتِ صرف اپنی محبوبِ ندیموں کو پلایا کرتی ہیں۔ اور تمہاری سرتوں کے لئے آج کی شب تمہارا پیغمبر اپنے تجلی بار چہرہ سے نقابِ جدِ اکردینگا۔

مقنع کا ایک ایک لفظ جماعت پر سحر کا سا کام کرتا ہے، اور یہ لوگ پھر ایک نئی طاقتِ عمل سے بے زیرِ نظر آتے ہیں، لیکن انکی یہ حیاتِ تازہ ایک سرابی زندگی ہے، جس طرح دمِ نزع کوئی

شخص سنبھالا لے اور ایک شربت کا گھونٹ لیکر ختم ہو جائے۔ وہ اپنے نیروں اور تلواروں کو جوش مسرت میں بلند کر کے "آج کی رات" کا نعرہ لگاتے ہیں، متفع بھی انکا ہم آہنگ ہو جاتا ہے، مگر اسکی آواز میں جوش و شوق معدوم ہے، اور اسکا دل اندر ہی اندر بیٹھا جا رہا ہے۔ دنیائے ان صید ہائے فریب خوردہ کی مسرتوں سے زیادہ المناک شاید ہی کوئی مجلس عزا، دیکھی ہو۔

رات نصف سے زیادہ گزر جاتی ہے، اور سرخوشانہ مگر بے نتیجہ نعروں کی ہنگامہ آرائی کے بعد ایک خوفناک سکوت طاری ہو جاتا ہے۔ زلیخا ویرانی دلی سوگوار زلیخا، دوسرے حصہ مکان میں متفکر و متامل ہے، کہ ایک غلام، متفع کی طرف سے پیغام طلب لیکر آتا ہے۔ وہ اپنے کانپتے ہوئے ہونٹوں سے اس پیغام کو سناتا ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ اسکا رنگ سیاہی مائل ہو جاتا ہے، اور اس سے قبل کہ وہ پیغام کے الفاظ دہرا سکے، زلیخا کے قدموں پر مردہ ہو کر گر پڑتا ہے۔ زلیخا سر سے پیر تک لرز جاتی ہے کہ اب خود اسکا وقت بھی نزدیک ہے۔

ساری فضا خاموش ہو گئی تھی، حتیٰ کہ دشمنوں کے کیمپ سے بھی کوئی صدا نہیں آرہی تھی۔ اس سکون مطلق میں زلیخا مقام جشن کی سمت روانہ ہوتی ہے، لیکن دفعتاً ٹھہر جاتی ہے اور اپنے سامعہ کو ایک طرف متوجہ کر دیتی ہے۔ آہ، یہ متفع کے قہقہہ کی آواز تھی، مگر اس آواز خندہ کے بعد ہی ایک نہایت خوفزدہ آواز بھی سنائی دیتی ہے۔ کیا یہ صدائیں، محفل عیش اور مقام جشن سے آسکتی ہیں؟ وہ اندر داخل ہو جاتی ہے اور ایک پُر اکراہ منظر دیکھتی ہے۔ زردی مائل نمود صبح کی روشنی، شمعوں کی سفید و نحیف روشنی سے ملکر، جس منظر کو زلیخا کے سامنے پیش کر رہی ہے، وہ یہ ہے کہ تختہ ہائے محفل کا نفیس فرش ابتر ہے بخوردان آخری سانس لے رہے ہیں، پہلوؤں کے شکستہ ہار بکھرے ہوئے ہیں، صراحیاں اور پیالے جو بادہ طلا رنگ سے بھرے اور نہایت بے صبر و حرصانہ طریقہ پر خالی کئے گئے تھے، جا بجا اوندھے پڑے ہیں۔ یہ سوال فضول ہے کہ وہ کس قسم کے جرعوں سے لبریز تھے، کہ اسکے آثار سے تو اس مقام کا ہر حصہ معمور ہے۔

جشن کے ہر مہمان کا چہرہ یا تو سیاہ ہو کر سینے کی طرف جھک گیا ہے، یا آسمان کی بلوری صباحتوں کو دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ بعض جو درحقیقت بہادر تھے، اور میدان جنگ میں اپنے پیغمبر کے پہلو بہ پہلو نہایت کشادہ پیشانی کے ساتھ موت کا خیر مقدم کرنے کو طیار و آمادہ تھے، اسوقت بحس و حرکت ہو کر رہ گئے ہیں، مگر ان کی حالت سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس عیاری و مکاری سے وہ دم واپس میں واقف نہ ہوئے

تھے، اور یہی وجہ ہے کہ جذبہ انتقام ان کی آنکھوں میں قائم ہو کر رہ گیا ہے۔
 مقنع کا نقاب اٹھا ہوا ہے، تاکہ رہروانِ حجیم کی آخری نگاہیں اچھی طرح سیراب ہو لیں، لیکن وہ
 اسکی شکل میں اس تجلی موعود کو نہیں پاتے، جن کی برق صفتی دشمنوں کی جمعیت عظیم کو آن واحد میں
 خاکستر کر دینے والی تھی؛ بلکہ وہ ایک صورت دیکھتے ہیں، جسکے سامنے عفریتِ جنم اور غولِ بیا بانی
 ہی خوش منظر و خوبصورت کہے جاسکتے ہیں۔ مقنع بعض ہلاک شدہ اور بعض نیم جاں فدا بیانِ مذہب
 کو مخاطب کر کے کہتا ہے:-

اے عاقلانِ بگزیدہ! اپنا ستارہ، اپنی روشنی دیکھ لو، تم کسی نہ کسی کا حیلہ کار اور شکار
 ہونے کیلئے مخلوق ہوئے تھے، کیا یہ کافی نہیں؟ اور کیا یہ ضروری ہے کہ میں وہ آخری
 ذرہ زندگی بھی، جو تمہارے باقی رہ گیا ہے، تم سے چین لوں؟ تمہیں معلوم ہے کہ یہ مرگ
 ہیبت جو تمہارے اندر اسوقت شعلہ زن ہے، وہ درجہ بخود می ہے، جہاں سے
 برکاتِ سماوی شروع ہو جاتی ہیں۔ یہ مکروہ صورت جس سے زیادہ بدہئیت شکل کبھی
 بھی ظالم نسل انسانی کی تحقیر کا باعث نہیں ہوئی، خود قدرت کی وضع کردہ اور پسندیدہ ہے۔
 افسوس میری تبریک و تهنیت نصف ہی بیان نہ ہونے پائی تھی کہ یہ ناشائستہ روحمیں
 پرواز کر گئیں، اچھا نیک روح، الوداع!

ابا، میری نوجوان عروس! بہتر ہوا کہ تو آگئی، معلوم ہوتا ہے تو نے اس سے قبل مردوں
 کو کبھی نہیں دیکھا۔ کیونکہ تو کانپ رہی ہے۔ نہیں، تو تو ان کو دیکھ چکی ہے، میری پیاری
 انہوں نے تو ہمارے عقد کی رسم ادا کی تھی، آج میرے ان مہمانوں نے اپنے رخصتی جام
 خوب لبریز کئے اور لازم ہے کہ تو بھی ایک پیالہ شراب پر تجدد عہد کرے۔ مگر یہ کیا ہے؟
 یہاں تو شراب کا ایک قطرہ ہی باقی نہیں رہا، اور ہمتِ نامِ ظروف خالی پڑے ہیں۔
 میری نوجوان محبوبہ! سمجھ سے قبل یہاں حریصوں کا مجمع تھا، اور انہوں نے ایک قطرہ
 شراب ہی باقی نہیں چھوڑا؛ لیکن ذرا ٹھہر، ایک قطرہ باقی رہ گیا ہے، وہ اسقدر کیف پرور
 ضرور ہوگا کہ ایک نازک پیغمبرہ کے خون کو حرارت میں لے آئے۔ لے، پی جا! اور اگر
 تیرے عاشق کا دستِ نصرت اس مقام تک دراز ہو سکے اور اسوقت تک تیرے

لوں کا نشف و انجذاب زائل نہ ہو جائے، تو اپنے ایک بوسہ کے ذریعہ سے اسکا نصف
زہر اُس کو پہونچا دیجیو۔ کیونکہ اس صورت میں مجھے اپنے رقیب کی یہ خوش نصیبی و
عشرت پذیری کہ وہ تیرا بوسہ لے، گوارا ہو سکتی ہے اور میں اُس کی اس جرات
کو نظر انداز کر سکوں گا۔

مجھے اب خود ہی فنا ہو جانا ہے، لیکن میں ان سبت و ذلیل لوگوں کی طرح فضا کو
متعفن نہیں کرنا چاہتا۔ میں اس طرح نہیں مرنے چاہتا کہ میری لاش کی ذلت کی جائے
اور جب میں دفن کیا جاؤں تو دنیا طعن کرے کہ ”یہ ہے وہ جو پیغمبری یا خدائی کا مدعی
تھا“ میں آتش شعلہ زن میں اپنے تئیں جلا کر خاکستر کر دوں گا، کیونکہ وہ ایک ایسا غسل
نور ہوگا، جو پیغمبروں کے لئے موزوں ہے۔ اس سے قبل کہ مجھے یہ شعلہ راگھ کی صورت
میں بدل دیں، تیری نبضیں ہی ساقط ہو چکی ہوں گی۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ ایک متنفس بھی ایسا
باقی رہے جو میرے بعد دنیا کو اطلاع دے کہ متفع کہاں گیا ہیں یہ چاہتا ہوں کہ میری منشا شرمست، جو ہوت و معلوم
کہاں کہاں پر شاں ہے، دنیا کے سامنے کہہ سکے کہ ”پیغمبر آسمانی تو آسمانوں سے آیا تھا اور آسمان ہی کی سمت چلا
گیا، اور صرف اسے روپوش ہوا ہے کہ ایک روشن اور بے نقاب مستبسم کے ساتھ دنیا میں پہونچا یا جائے۔“ دنیا
اپنی خوش اعتقادی سے میرے نام کی عبادت گاہیں قائم کرے گی، جہاں چالاک و
حیلہ جو لوگ مجاور می کیا کریں گے۔ اور اس طرح میں مرکز ہی اس نسل انسانی سے
انتقام لیتا رہوں گا۔

اب وقت باقی نہیں رہا ہے۔ دیکھ کہ مجھ جیسا بدکردار کیونکر ایک معبود بن سکتا ہے!
متفع کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور اپنے آخری جملوں کے ساتھ ہنی اپنے تئیں آگ کے شعلوں
کے سپرد کر دیتا ہے، اور زلیخا تنہا رہ جاتی ہے۔

صبح نمودار ہوتی ہے اور محاصرین، شہر کی دیوار پر حملہ کرتے ہیں، یہاں تک کہ دیوار میں ایک چوٹا
سارا سہ پیدا ہو جاتا ہے۔ عظیم فوج کے بڑے حصہ کو نیکر اندر داخل ہو جاتا ہے، ہر خد کہ خلیفہ ہمدی
کو اس طرح داخل ہو جانے میں تامل ہوتا ہے۔ شہر کے راستے قطعاً ویران ہیں، اور یکسر خاموشی طاری
ہے، الغد ام حیات کا ثبوت ہر قدم پر نظر آرہا ہے، تمام سپاہ اسلام حیران و سرگشتہ ہے کہ سامنے سے

ایک نقاب پوش ہستی نمودار ہوتی ہے۔ اور وہی ہے، اکاشور مخ جاتا ہے، مقنع اور تنہا، کا غل بپا ہو جاتا ہے۔ اسکو دیکھتے ہی عظیم، خلیفہ کی رکاب پکڑ لیتا ہے اور کہتا ہے خلیفۃ المسلمین، یہ میرا حصہ ہے۔ اس شیطان مجسم کو میرے سوا کوئی قتل نہ کرنے پائے۔ حضور سے میری یہی ایک التجا ہے، خلیفہ اس درخواست کو منظور کر لیتا ہے، اور عظیم نہایت سرعت کے ساتھ، نقاب پوش کی جانب بڑھتا ہے، اور جیسے ہی وہ دونوں ایک دوسرے کے مقابل ہو جاتے ہیں، عظیم کا نیزہ اس کے جسم میں تیر جاتا ہے۔ نقاب سرگنا اور چہرہ کھل جاتا ہے اور عظیم، مقنع کے بجائے جمالِ زلیخا کا نظارہ کرتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ اسکا خون حیات بہا جا رہا ہے، اور اپنے ریشہ ناک ہاتھوں سے اُسے اٹھا لیتا ہے۔ زلیخا کہتی ہے:-

آہ عظیم! میرے پیارے! میں نے یہ خیال ہرگز نہیں کیا تھا کہ اس اداے فرض کی تکلیف تھکودوں، تمہاری موجودگی میں اس طرح کی موت آنا، ہر چند کہ بشیارات و برکات کا موجب ہے اور میرا دل گواہی دیتا ہے کہ تم باوجود میری نااہلی کے مجھے ان سے محروم نہ کرنا چاہو گے۔ کاش تم جان سکتے کہ میں نے کتنی بار خدا کی درگاہ میں یہ تمنا کی ہے کہ میری موت تمہاری موجودگی میں آئے! ملعون مقنع کا زہر اس قدر قلیل تھا، کہ اسکا اثر اب تک نہ ہو سکا اسی لئے میں نے چاہا کہ اس کا نقاب پہن لینے سے فوراً ہی تو صدمہ تلواریں میرے اوپر برسے لگیں گی اور میں چشمِ زدن میں اس کرب سے نجات پا جاؤں گی۔ شکر ہے کہ اسوقت وہ تمام ظلمت و تاریکی، مایوسی و بیچارگی، جو میری آوارہ روح کی انیس تہی، نہایت آسانی سے رفع ہوتی جا رہی ہے۔ تمہاری نگاہِ لطف کی روشنی میرے اوپر اس طرح نازل ہو رہی ہے جس طرح رحمت خداوندی کی اولین نمود صبح۔ اور اگر تمہارے پیارے لبوں سے میں یہ سن سکوں کہ تم نے مجھے معاف کر دیا، تو میں فرشتوں کی زبان سے بھی یہ الفاظ دہراتے ہوئے سن لوں گی۔ لیکن میرے پیارے عظیم، اُف! تمہیں اپنا کہہ کر کبکا رنا ایک رویاے جنت ہے، تم زندہ رہنا! میرے لئے زندہ رہنا! اگر تمہیں کبھی بھی مجھ سے محبت ہوئی تھی، اگر تمہارے لئے اپنی زلیخا سے دوسرے عالم میں ملنا گوارہ

ہو سکتا ہے، تو زندہ رہنے کی کوشش کرنا! اور صبح و مساء درگاہ خداوندی میں، جسکے
 حضور، عظیم، تمہارے ہونٹھوں اور دل سے پاکتر ہونٹھوں نے کبھی دعا نہ مانگی ہوگی،
 میرے لئے دعائے مغفرت کر؛ شاید اس کی رحمت سے، اس لئے کہ تم طلب عفو کرو گے،
 اور اس لئے کہ میرے دل میں تمہاری محبت کا مسکن ہے، مجھ پر عنایت ایزدی ہو جائے!
 ان باغوں اور مرغزاروں میں جانا جہاں اول اول، دو دل ایک دوسرے میں جذب
 ہو گئے تھے۔ اس فضا میں صبا کا ہر جھونکا وہاں کے ناقابل فراموش پہلوں پر سے گذرتا ہوا تمہاری
 روح کے لئے پہر وہی شیریں اور معصوم ساعتیں پیش کرے گا۔ اور ممکن ہے کہ تمہارے دل میں نصیب
 زلیخا کے لئے پہر وہی جذبات پیدا ہو جائیں۔ شبنم کے ان قطراتِ عشق سرشت کی طرح، جو جلوہ
 خورشید کے عکس فگن ہوتے ہی، جو سما میں جذب ہو جاتے ہیں، تمہاری دعائیں ہی محبت کی تمام
 خوشبوؤں کے ساتھ عرش تک پہنچیں گی اور اگر ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن اب میرے حواس ساتھ
 نہیں دیتے ہیں ان ایک لمحہ ۔ ۔ ۔ اور اگر تمہاری دعائیں مقبول ہوئیں اور اگر مغفور روحیں اس دنیا میں
 اسلئے آسکتی ہیں کہ وہ اپنی راحتوں اور مسرتوں کا اظہار ان پر کر سکیں، جن کے ساتھ انکو محبت
 رہی ہے تو میں تمہارے پاس آؤنگی، ایک خواب شیریں بنکر آؤنگی اور کہوں گی ”میں وہی ہوں!“
 پیارے محبوب، خدا حافظ!

(۷)

دنیا میں کیسے ہی اہم اور سنگین حادثات اور واقعات کیوں نہ رونما ہوں، وقت کی روانی
 کچھ اس قدر سریع اور اس درجہ منہمک ہے کہ اسکو کوئی شے اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتی؛
 اور وہ کسی کے روکنے سے نہیں رکتی۔ زلیخا کی ہلاکت کے بعد زمانہ گذرتا گیا حتیٰ کہ عظیم نے اپنے
 شباب کو شیب سے بدل لیا۔

دریاے جیحون کے مصفا کناروں پر ایک بوسیدہ قبر کے پہلو میں ایک ضعیف آدمی جھک رہا ہے،
 آفتاب صباحی نے مدتوں اسکے غمزدہ چہرہ پر آنکھ کھولی ہے، اور شام کے ستارے ایک مدت
 اُسے اسی طرح مشغول دعا دیکھ رہے ہیں۔ آج اسوقت بھی وہ اس فرض محبت کے ادا کرنے میں
 مصروف و محو ہے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ اسکا یہ فرض اب ختام کے قریب ہے، کیونکہ اسکے چہرہ پر

علاماتِ مرگ نمایاں ہیں، لیکن اسکے ساتھ موت کی حسرتوں میں ملی ہوئی ایک شعاعِ طمانیت
اسکی ضعیف مگر منور پیشانی پر موجزن نظر آرہی ہے، جس نے موت کو بھی حسین و پر رونق بنا دیا
ہے۔ جس طرح شام کی ادا اس تارکیوں میں شفق کا شہابی رنگ دلکش ہو جاتا ہے، اسی طرح
اس ضعیف ہستی کی چند آخری سانسیں بھی رنگینیِ مسرت سے دمک رہی ہیں۔

گذشتہ رات اس نے زلیخا کو خواب میں دیکھا ہے جو اس سے عالمِ رویا میں کہہ رہی ہے
”رحمتِ الہی نے میری غزشوں کو معاف کر دیا!“ یہ مژدہ روحِ فزاسن لینے کے بعد عظیم شکرانہ
نعمت میں اپنی آخری سانسوں کی صرف کر دیتا ہے اور خود بھی زلیخا کے پہلو میں ہمیشہ کے لئے
الفت و مسرت کی نیند میں غرق ہو جاتا ہے۔

ل۔ احمد

غزل

از حضرت سہا (علیگ)

جھگڑے ہیں زندگی کے سب، آ، اور انہیں مٹا بھی جا
جذبِ دُروںِ قلب کو، بے ادب جنوں تو کر
میری تباہیوں کا کیا، عشوہ طرازیوں تو ہیں
عیش کی راحتیں نہیں، کرب کی کروٹیں سہی
دل سے فرازِ عرش تک آہ کن راہِ راست ہے
آج تو مرگِ ناگہاں، غم سے ہمیں چھڑا بھی جا
اپنے بھی دل کی کہہ گذر، اور اسے آزما بھی جا
تجربہ وفا سے کیا غرض، تو تو نظر چرا بھی جا
عمرِ رواں کے ناز ہیں۔ چند گھڑی اٹھا بھی جا
درد بھی ایک راز ہے، دل ہی میں کھچپا بھی جا

خوفِ مزاج یار کا، شوق سے کیوں فزوں رہے
کیا پس پیش ہے سہا، بڑھکے گلے لگا بھی جا

مزار

(راز حضرت ناصر اٹاوی)

چراغِ کشتہٴ عمرِ میدہ کا دہواں ہوں میں
مرا ہر ذرہ لبرِ نرِ نوائے سازِ ہستی ہے
اماں سے کشمکشِ ہائے جہاں سے میرے پہلو میں
ٹھکانا مل گیا ہے سرکشوں کو سر چپانے کا
تلی ہے گردشِ ارضِ فلک میرے مٹانے پر
کشیدہ بادِ صرصر، ابر باراں در پئے اندا
جوانی میں مٹا ہے کوئی ناکام غمِ الفت
مری آغوش میں مدفون ہیں لاکھوں تمنائیں
دلِ وحشت نصیبِ ناصرِ خانان ہوئیں

انور نے اپنی تمام عمر صرف ایک خیال کی پرستش میں بسر کر دی، لیکن اس کی حیات میں جو سرا
اضطراب و خلش تھی۔ اس سے زیادہ ہلک لمحہ کوئی نہ ہوتا تھا جب اسے یہ یقین ہونے
لگتا تھا کہ اس کا موضوع پرستش ایک حقیقت مرنی ہے

منحور

مسئلہ نور پر اک ہلکی سی روشنی

جناب محترم، ابوالحسن مولوی محمود علی صاحب، اگر ۱۲ فروری کی وہ صحبت آپ کی یاد سے محو نہیں ہوئی، جس کے آخری لمحات میں مسئلہ نور کے متعلق میرے اور آپ کے درمیان اک مختصر سی بحث ہو کر رہ گئی تھی، تو میں آپ کی توجہ اس طرف منعطف کرانا چاہتا ہوں اور آپ کے اس دعوے پر کہ ”نور متحرک ہے اور اجسام صغارا کا مجموعہ“ میں اپنے شبہات پیش کرتا ہوں۔

مجھے امید ہے کہ آپ اپنے خیالات نگار ہی کے ذریعہ سے پیش فرمائیں گے اور نہایت آزادی سے ان اختلافات کو بیان کریں گے جنکا تعلق میرے اعتراضات سے ہے۔

نیاں

(۱) حکماء کا دعویٰ ہے کہ ”نور جسم ہے اور حرکت کرتا ہے“ ہم نہیں کہہ سکتے کہ انہوں نے نور کو جسم اس لئے خیال کیا، کہ اس میں حرکت پائی جاتی ہے یا اس کی حرکت اس لئے تسلیم کی کہ وہ جسم ہے، لیکن بظاہر ایسا ہی معلوم ہوتا ہے، کہ انہیں سب سے پہلے نور کی حرکت کا خیال پیدا ہوا، اور بعد کو اس حرکت کی وجہ، جس سے نور کو جسم ماننا پڑا، اس لئے اب عام طور سے نور کی حقیقت اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ:-

”نور، اجسام صغارا کا مجموعہ ہے جو جسم مضی سے جدا ہو کر جسم مضی پر آکر گرتا ہے۔“

ہمیں سب سے پہلے نور کو جسم فرض کر کے، یہ دیکھنا چاہیے، کہ اس میں حرکت کس قسم کی ہوتی ہے۔ حرکت کی تین صورتیں ہوا کرتی ہیں:- ارادی، طبعی، قسری۔ غالباً اس سے تو آپ کو بھی انکار نہ ہوگا کہ نور کی حرکت ارادی نہیں ہے، یعنی خود وہ قصد و ارادہ کر کے حرکت نہیں کرتا۔ ممکن ہے کہ آپ کہیں نور کی حرکت طبعی ہے، لیکن یہ بھی صحیح نہیں، کیونکہ حرکت طبعی ہمیشہ ایک جہت میں ہوتی ہے اور نور (حرکت فرض کر لینے کی صورت میں) کی حرکت ہر جہت میں محسوس ہوتی ہے۔ رہ گئی حرکت قسری، سو وہ بھی تسلیم نہیں کی جاسکتی، کیونکہ حرکت قسری (یعنی حرکت مخالف طبع) بھی وہیں پائی جاسکتی ہے، جہاں حرکت طبعی کا وجود ہو۔

جب جسم کی تینوں حرکتیں، نور میں نہیں پائی جاتیں، تو ظاہر ہے کہ وہ جسم نہیں ہے۔ یہ واضح رہے کہ آپ جسم کو عرض ہی نہیں کہہ سکتے، کیونکہ وہ آپ کی قول کے مطابق آفتاب سے منتقل ہو کر زمین تک پہنچتا ہے اور اعراض کا انتقال محال ہے، اسی طرح آپ اسے جو ہر بھی تسلیم نہیں کر سکتے۔ کیونکہ جو ہر محدود ہے، ہیولی، صورت، عقول، و نفوس میں واجب الوجود ہی آپ اسے نہیں کہہ سکتے، اس لئے ظاہر ہے کہ وہ موجودات کی کسی قسم میں داخل نہیں اور اس کا وجود فی الخارج کہیں نہیں پایا جاسکتا۔

(۲) اسی سلسلہ میں اگر آپ نگاہ کو بھی نور سمجھ کر اس میں حرکت ثابت کریں گے، تو یہاں بھی حرکت کے متعلق وہی گفتگو پیش آئے گی جو ابھی عرض کی گئی۔ لیکن اگر آپ بصارت کو صرف انطباع کہیں گے (یعنی صورت مرئی آنکھ کے پردہ پر منطبع ہو جاتی ہے) تو بھی بہت سی مشکلات آپ کو رفع کرنا پڑیں گی۔ کیونکہ انطباع اور صورت مرئیہ کے درمیان جو ربط پایا جاتا ہے، وہ تین حال سے خالی نہیں ہو سکتا۔ یا تو صورت مرئیہ، انطباع کے وقت اپنی جگہ سے جدا ہوتی ہے یا نہیں ہوتی۔ یا دونوں باتیں پائی جاتی ہیں۔ اگر آپ جدا ہونا تسلیم کریں گے، تو صورت مرئیہ کا وہاں سے فنا ہونا لازم آئے گا جو بالکل خلاف واقعہ و حقیقت ہے اور اگر جدا نہیں ہوتی تو آنکھ میں کوئی نئی کیفیت پیدا نہ ہوئی جس سے حقیقت انطباع واضح ہو سکے۔ تیسری صورت کا بطلان ظاہر ہے کیونکہ ایک ہی وقت میں کوئی شے دو مختلف چیز و محل میں نہیں پائی جاسکتی۔

اگر آپ کہیں کہ شے مرئیہ کا احساس، عرض کی صورت میں ہوتا ہے، یعنی اسکے اعراض منطبع ہوتے ہیں تو ظاہر ہے کہ یہ انطباع، مقولہ کیف سے ہو گا یا کم سے، اگر مقولہ کم سے ہے، تو وہ قار الذات ہو گا اور اس کا ادراک ہاتھ سے ہی ہو سکیگا۔ اگر مقولہ کیف سے ہے تو اسے وجدانی ماننا پڑے گا، لیکن وہ وجدانی نہیں ہے کیونکہ کیف کسی محل میں اور وجدان اس کا کسی اور محل میں ممکن نہیں، آپ غیر وجدانی بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ پھر اسے جو اس اربعہ سے محسوس ہونا چاہیے حالانکہ یہ باطل ہے۔

(۳) نور اگر اجسام صغار کا مجموعہ ہے، تو چاہیے کہ زیادتی نور کی، اشیاء مرئیہ کو اور دھندلا کر دیا کرے، کیونکہ زیادتی نور، زیادتی اجسام ہے، اور اجسام کی زیادتی بصارت اور شے مرئی کے درمیان حائل ہو کر مانع بصارت ہو کر رہتی ہے۔

اسکا جواب آپ یہ دے سکتے ہیں کہ یہ شان صرف رنگین و کثیف اجسام کی ہے کہ وہ بصارت اور
شے مرئی کے درمیان حائل ہو جائیں، اجسام شفاف پر یہ بات صادق نہیں آتی، لیکن اس صورت
میں آپ کے پاس کیا جواب ہوگا اس اعتراض کا کہ ایک کوتاہ نظر شخص کیوں نہیں محدب شیشے
کی عینک سے، اسی طرح صاف دیکھتا، جس طرح ایک ضعیف البصارت آدمی۔ اور کیا وجہ ہے
کہ ایک متعثر شیشے کی عینک، کمزور نگاہ کے لئے بالکل بیکار ہے۔ آپ یہاں پر اسی مسئلہ بصارت
الطباع کا حوالہ دیں گے، لیکن میں پھر وہی اعتراض کرونگا جو اس سے قبل بیان کر چکا ہوں۔
(۴) نور اگر اجسام صغیر کا مجموعہ ہے، تو ظاہر ہے کہ ان اجسام میں بالطبع روشنی موجود ہے اور
جب تک وہ فنا نہ ہو جائیں ان میں روشنی کا وجود ہونا چاہیے۔ جس وقت آپ کسی کوٹھری کے
روشنندان کو بند کر دیتے ہیں تو کیوں دفعۃً تاریکی ہو جاتی ہے۔ اگر نور کے اجسام صغیر کوٹھری کے
اندر موجود ہیں، تو تاریکی نہ ہونا چاہیے اور اگر وہ اجسام فنا ہو گئے تو کیوں اور فنا ہو کر وہ کہاں
گئے۔

(۵) اگر کسی کمرہ میں صرف ایک سوراخ روشنی کیلئے ہو، تو چاہیے کہ اگر کوئی دبیر شیشہ اسپر لگا دیں
تو روشنی نہ آئے کیونکہ نور کے اجسام صغیر اندر داخل نہ ہو سکیں گے۔ اگر آپ نے اسکا جواب یہ دیا کہ
وہ ایک مادہ اثیریہ ہے، جو شیشے کے اندر سے نفوذ کر جاتا ہے، تو اسپر یہ اعتراض وارد ہوگا کہ جب
شیشہ کو سیاہ رنگ دیا جاتا ہے تو پھر یہ مادہ اثیریہ کیوں اس میں نفوذ نہیں کرتا۔

(۶) اگر رویت کی حقیقت، سراسحاق نیوٹن کے اصول کے مطابق یہ ہے کہ ”جب اجزاء نور، کسی جسم
کو روشن کر کے پلٹتے ہیں تو اسی کے ذریعہ سے وہ اشیاں ہلکوا نکھ سے نظر آتی ہیں“ تو چاہیے کہ جس
وقت اجزاء نور موجود نہ ہوں، بلا استثناء کوئی چیز کسی کو نظر آئے، درانحالیکہ ”شپرہ چشم“ کا فلسفہ
بصارت اس سے بالکل مختلف ہے۔ وہ رات ہی کو زیادہ دیکھتا ہے اور دن کے وقت جب
اجزاء نور کی کثرت سے پائے جاتے ہیں تو وہ اندہ ہو جاتا ہے۔ علاوہ اس کے امریکہ میں ایک
خاتون ہے جو شب تاریکی میں نہایت اچھی طرح کتاب پڑھ لیتی ہے۔

(۷) آپ نے دیکھا ہوگا کہ جس وقت انسان دہوپ میں چلتا ہے، تو اسکے ساتھ ساتھ سایہ
بھی چلتا ہے، اس صورت میں چونکہ سایہ کی حرکت بدیہی ہے اسلئے آپ کو اسے بھی جسم کہنا

چاہیے دراصل ایک کوئی شخص سایہ کو جسم نہیں کہہ سکتا۔ یہ بالکل کہلی ہوئی بات ہے کہ حرکت سایہ میں نہیں ہوتی بلکہ سایہ ایک جگہ پیدا ہو کر فنا ہو جاتا ہے، اور پھر دوسری جگہ پیدا ہوتا ہے، لیکن چونکہ جسم کی حرکت کے ساتھ وہ بہت جلد جلد بگڑتا اور بنتا ہے، اس لئے ہم کو آنکھ سے ایسا ہی نظر آتا ہے۔

اگر روشنی کی حقیقت بھی کچھ ایسی ہی تسلیم کی جائے، کہ جب آفتاب کے محاذ میں کوئی چیز آتی ہے تو منور ہو جاتی ہے، اور محاذ کے ساتھ ساتھ روشنی مٹتی اور پیدا ہوتی رہتی ہے، تو اس سے صرف ایک شے محسوس کا علم تو ہو جائیگا لیکن اس نور کی کیفیت پر ہی مبہم رہ جائیگی۔

(۸) اگر آنکھ کا نور ہی آفتاب کے نور کے مانند ہے اور ضیاء چشم کا نور آفتاب سے متاثر ہونا ضروری ہے، تو اس سے داخل اجسام لازم آئیگا، جو محال ہے، اور اگر داخل اجسام نہ مانئے گا، تو پھر نور بصر کا کسی اور طرح متاثر ہونا ثابت نہیں ہو سکتا۔

(۹) مجھے امید ہے کہ آپ اس پر کامل غور کریں گے، ممکن ہے کہ آخر میں میری طرح آپ پر بھی یہ سب کچھ صرف نفس کی ایک "کیفیت انکشافیہ" نظر آئے اور تمام تحقیق، محض ظن و تخمین کا کرشمہ ثابت ہو۔

یہ بحث بہت طویل ہے لیکن میں نے اس کے تمام پہلوؤں پر ابھی سے اس لئے روشنی نہیں ڈالی، کہ آپ کے لئے ان سب کا جواب دینا فرصت مدید کا طلبگار ہوتا اور مجھے معلوم ہے کہ آپ کے پاس وقت کم ہے، لیکن اگر آپ نے اس بحث کے سلسلہ میں ان مسائل کا بھی ذکر کر دیا، جن کو میں نے قصداً ترک کر دیا ہے تو آئندہ اشاعتوں میں، میں اپنی رائے ظاہر کر نیکا مجاز ہوں گا۔

مہر منیر لکھنوی کی ایک غزل موصول ہوئی ہے جس کا یہ شعر نہایت خوب ہے :-

راتوں کا رونے والا زمانہ سے اٹھ گیا

تا صبح خوب چین سے سویا کرے کوئی

محبت کی بوی

(اثر: نیاز فتحپوری)

زمین خدا جانے کتنی بار آفتاب کے گرد تصدق ہو چکی، معلوم نہیں چاند کتنی مرتبہ کرہ ارض کی اوٹ سے اپنی پیشانی کا ہلال دکھا دکھا کر غائب ہو گیا اور زمین کے بخارات نہ معلوم کتنی دفعہ فضا کے آسمانی میں ابر بن بن کر قطرہ زن ہوئے، لیکن رادھا نے جو عزت نشینی اختیار کر لی، وہ اسی طرح قائم رہی اور دیل کے کسی مندر میں پوجا کرنے کیلئے وہ کبھی نہیں آئی۔

صبح و شام، مندروں کے گھنٹے اب بھی ہوا میں گونجا کرتے ہیں، دیل کی آبادی اب بھی بدستور اپنی پر خلوص پیشانیوں کو بودھ کے مقدس استھان کے سامنے گھستی ہوئی نظر آتی ہے، لیکن رادھا پھر اپنے مکان سے نہیں نکلی اور مندروں آنے والا ہر نوجوان یہ محسوس کرتے لگا کہ آسمان کی اس الہتہ الجہال (زہرہ) کی طرح، جو چہرہ پر ایک باز نقاب ڈال لینے کے بعد، افق مغرب کو اکٹا مانہ دراز کیلئے بے نور بنا جاتی ہے، اب شاید رادھا بھی نظر نہ آئے گی۔

نغمائے پرستش، معبد کے در و دیوار سے اب بھی صدائے بازگشت پیدا کیا کرتے ہیں، جنگ و رباب کے تار و دہاں کی فضا میں اب بھی اپنی لرزشوں کو موسیقی میں تبدیل کرتے رہتے ہیں، لیکن اک رادھا کے نہ آنے سے جو اُداسی وہاں کی فضا میں پیدا ہو گئی ہے، گو اس کا علم بودھ کے پوجاریوں کو نہ ہو، لیکن دیل کا ایک ایک نوجوان اس کا زخم اپنے دلیں لئے ہوئے ہے۔

(۲)

آفتاب غروب ہو رہا ہے اور قریب کی پہاڑی جو بارش کے اثر سے زمردین ہو چلی ہے، اُن گلہ بانوں کی بانسریوں سے، جو اپنا وداعی راگ قدرت کے اس شاداب چراگاہ کو سنارہے ہیں، معمور ہے۔ رادھا اپنی جنوٹری کے سامنے ایک پتھر پر بیٹھی ہوئی اس منظر کو دیکھ رہی ہے اور اس طرح متحیر ہے، گویا وہ ایک بت ہے، جسے یونان کے عہد زریں میں یہاں نصب کیا گیا تھا اور اب اسکی پرستش کرنے والے دنیا سے اٹھ گئے ہیں۔ اس کی صورت سے عشق کا ایسا سوگ ٹپک رہا ہے،

محبت کا وہ سوز ظاہر ہو رہا ہے، گویا کہ وہ اندر ہی اندرستی ہوئی جا رہی ہے اور دنیا میں اس رسم کا دیکھنے والا اور اس نوجوان غمزدہ لڑکی پر آنسو بہانے والا کوئی نہیں ہے۔

راؤ ہا، دیسل کی ان چند لڑکیوں میں سے تھی، جن کے حُسن کی داستانوں سے وہاں کی کوئی رنگین محفل خالی نظر نہ آتی تھی، لیکن راؤ ہا اسلئے زیادہ تباہ کن تھی، کہ اس کے حُسن کے ساتھ کوئی آرزو وابستہ نہ ہو سکتی تھی، اور وہ اپنی سیرۃ کے لحاظ سے اس قدر بلند تھی کہ ایک انسان کا اس سے محبت کرنا، گویا ملا را علی کی کسی مخلوق سے محبت کرنا تھا، اس لئے جب تک وہ ایک مندر میں آتی رہی، ایک دیوی ہی کی طرح اس کی عزت کی گئی اور جب اس نے آنا ترک کر دیا تو کسی میں یہ سمجھ نہ ہوئی کہ اس کے مکان تک جائے، کیونکہ ایک دیوی کے خلو خانے میں کسی انسانی ہستی کا گزر نہیں ہو سکتا۔

(۳)

”اے پر ماتما، میں کیا کروں؟ میں اس شرم کا اظہار کیوں کر کروں، جو تیرا نام لیتے ہی میرے سارے جسم کو ایسا بنا دیتی ہے، جیسے بید کی وہ نازک ڈالی جو ہوا کا ہلکا سا جھونکا گزر جانے کے بعد بھی گھنٹوں تھر تھرا یا کرتی ہے، کانپا کرتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں راؤ ہا نے تیری پوجا چھوڑ دی، بیشک چھوڑ دی، لیکن انہیں کیسے یقین دلاؤں کہ راؤ ہا اب تیرا نام لینے اور تیرے سامنے سر جھکانے کے قابل نہیں رہی۔

اپنے دل میں، اب جس آرزو کی پرورش میں کر رہی ہوں اس کا تعلق اُسی جسم سے ہے، جسے میں نے تیرے لئے تھج دیا تھا، مگر وہ آرزو تجھ سے علیحدہ ہے۔ پھر جس نے تیری پرستش اس طرح کی ہو کہ جسم کے ساتھ اس کی روح بھی تیرے ردِ برد چھبک جائے، وہ کیونکر تیرا نام لے سکتی ہے، جبکہ وہیں تیرے سوا کسی اور کی صورت موجود ہو، اور روح، تیرے علاوہ کسی اور صورت کے لئے بیتاب۔

میں جانتی ہوں کہ تو میری پرستش کا محتاج نہیں، تجھ پر قربان ہونے کے لئے مجھ سے زیادہ اچھی روحیں موجود ہیں، لیکن میں اپنے دل کے اس درد کو کہاں لے جاؤں، جو تیری جدائی سے پیدا ہو گیا ہے۔ اے پر ماتما، یہ کس قسم کا عذاب ہے کہ میں نہ تجھ سے

جدا ہو سکتی ہوں اور نہ مل سکتی ہوں۔ یہ کس آگ میں تو نے مجھے ڈال دیا ہے جو مجھے نہ جلاتی ہے نہ آزاد کرتی ہے۔

وہ دن جب تیرے استہان پر، تیرے پوجاریوں کی قربانی ہو رہی تھی، اور میں بھی اس خیال سے اس شخص کی طرح، جس نے کوئی تیز شراب پی لی ہو ہست و مخور تھی، کہ عنقریب کسی ظالم کی تلوار میرے سینے میں بھی تیر جا بیگی اور میں اپنی حیات کا آخری قطرہ رنگین تیرے حضور میں پیش کر سکوں گی۔ آہ، وہ وقت میں کبھی نہیں ہو سکتی، جب اسی حال میں ان ظالموں کے سردار نے دفعۃً اگر اس خونی زری کو روک دیا اور اسکو دیکھتے ہی میرا وہ سجدہ جو تیرے لئے زمیں بوس تھا، چپکے ہی چپکے، اس کی حسین ظالم صورت کے لئے منتقل ہو گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ تو نے اپنے آسمان سے اٹھا کر مجھے نیچے پھینک دیا، اپنے تخت الوہیت سے گرا کر زمین کے نہایت گہرے عمق میں گرا دیا، لیکن روح پھر بھی اسی کے لئے سرسبز و تہی اور تجھے ہو جانے اور تجھ سے جدا ہو جانے پر زیادہ مغموم نہ تھی۔

لیکن اسے پراتما، میں تیرا احسان کہوں کہ اس پر بھی تو نے مجھے بچا یا اور نہ میرے لئے کچھ مشکل نہ تھا کہ اس کے سامنے ایک بار بے حجابانہ چلی جاتی، اور محبت کی وہ تمام لذتیں حاصل کر لیتی، جن کے لئے میں اب بھی ویسی ہی بیقرار ہوں جیسی کبھی تیرے قدموں میں ہوا کرتی تھی۔ پھر جبکہ تو نے میری ناپاک ہستی پر اتنا کرم کیا، تو کیا اس کو اور زیادہ وسیع نہیں کر سکتا، کیا تیری انگلیاں میرے دل سے اس محبت کو نکال کر پھینک نہیں دے سکتیں، جس نے تیری ستش کو چین لیا ہے، میں راضی ہوں اگر اس محبت کا نکلنا، جان کا نکلنا ہو اور اس خلش کا دور ہونا، جسم سے روح کا جدا ہو جانا ہو۔

مہینوں ہو گئے کہ صبح و شام تیرے مندر کے گھنٹوں کی آواز سن سکر کانپ کانپ اٹھی ہوں، اک زمانہ ہو گیا کہ روز تیرے استہان پر جا کر جان دینے کے لئے تڑپ تڑپ گئی ہوں، لیکن ڈرتی ہوں کہ کہیں میرے ناپاک قدم تیرے مقدس معبد کو خراب

نہ کر دیں، کہیں تو اس گستاخی سے برہم ہو کر، میرے دل کے اندر وہ جذبہ نہ پیدا کر دے، جو ایک عورت کے دل سے پاکدامنی کی عزت کو محو کر دیتا ہے۔ اسے پریشور، رحم کر اور محبت کے اس طوفان کو، جس کی لہروں پر میں نے اپنی نازک اور ٹوٹی ہوئی کشتی اس قدر پیرحمی سے ڈال دی ہے، دور کر دے۔ تیرے غصے کی آگ میں جل جانا مجھے منظور ہے، لیکن اس طوفان کی موجوں میں اپنی لاش دفن کرنا مجھے گوارا نہیں۔ کوئی لمحہ ایسا نہیں گذرتا جب میں اس کافر کی صورت و سیرۃ میں ہزاروں عیب نہ نکالتی ہوں، میں دل کو ہر طرح سے یقین دلاتی ہوں کہ اس کی آنکھیں خونخوار ہیں، اس کی فطرت جفا کار ہے، اس کی چٹون غضب آلود ہے اور اس کی ساری ہستی ناپاک و مردود، لیکن عین اسی وقت جبکہ میں یہ سب کچھ سمجھنا چاہتی ہوں، دل تڑپ کر خون کی ایک گرم موج میرے تمام شرانیں میں دوڑا دیتا ہے اور میں اس شراب کے نشہ سے مغلوب ہو کر بھر اسی کو پوجنے لگتی ہوں جس کو ذلیل سمجھنا چاہیے لیکن میں سمجھ نہیں سکتی۔

پھر تو ہی بتا کہ اس جنگ میں کب تک مصروف رہوں اور کیونکر اپنی شکست کی لذت کو محو کر دوں۔“

(۴)

راہ ہوا پر اس حال میں چند مہینے اور گذر جاتے ہیں اور اس کی محبت حرارت کی اس منزل تک پہنچ جاتی ہے جسے مصطلحات علم الکیمیا میں درجہ میاض سے تعبیر کرتے ہیں اور جس کے بعد کائنات کی ہر چیز، صرف و خواں ہو کر فضا میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ حقیقت ہے کہ محبت، جو چنگاری کی صورت میں اس کے دل کے اندر متمکن ہوئی تھی، اس کے لئے راہ کا ہر تنفس ہوا کا جو نکاشا بت ہوا، یہاں تک کہ چند او کے اندر وہ چنگاری اشتعال و التهاب کے تمام مدارج طے کر گئی، اور اب اس کیلئے صرف یہی باقی رہ گیا تھا کہ وہ کسی دن اپنے ہونہر پڑے کے گوشہ میں خاکستر کا ڈھیر نظر آئے یا اک آہ ہو کر ہوا میں مل جائے۔

اس کی غریب بیوہ ماں نے، علاج و چارہ سازی میں پوری کوشش صرف کر دی جس حد

تک اسکا افلاس اجازت دے سکتا تھا، اسنے کوئی دقیقہ اس کوشش میں نہ اٹھا رکھا کہ دیل کا یہ چاند گہن سے نکل جائے، لیکن وہ کامیاب نہیں ہوئی اور رادھار دوز بردھال ہی ہوئی گئی، گویا وہ اک شمع صبحی تھی جس کے مضمحل شعلے، صرف حلقہ شمع دان ہی کے اندر سے کچھ کچھ نظر آنے میں۔

اسکا جسم جو پہلے ہی بہت نازنین تھا، اب خطرناک حد تک نازک ہو گیا تھا اور اس آہگینہ نے اب حباب، ایک نہایت ہی نازک حباب کی صورت اختیار کر لی تھی۔

اسکا وہ رنگ جو کبھی کبھی یہ معلوم ہوتا تھا کہ جلد کے نیچے لپکلا ہوا سونا دھڑلہ ہے، رفتہ رفتہ زعفرانی، زرد، اور سفید ہو کر اب ایسا نظر آتا تھا گویا رادھام کوئی چاندنی کی مورت ہے، جس پر بارہ کی صفیل کردی گئی ہے۔ اس کی لابی لابی گھنی پلکیں جو حسین آنکھوں پر چارشف کے سیاہ ریشمی نقاب کی طرح پڑی رہتی تھیں۔ اس کی خوبصورت لابی گردن، جس کی صباحت میں کوثر و تسنیم کا رنگ چمکا کرتا تھا۔

اس کا وہ جسم جو سینہ و کمر کے تناسب شیب و فراز کو پیش کر کے دنیائے جذبات میں خدا جانے کس قسم کا تلاطم برپا کر دیا کرتا تھا۔ اس کی وہ پیاری پیاری پیشانی، جس کا صندل عبیر ملا کر ایک ملکوتی منظر پیش کیا کرتا تھا۔ اس کے وہ لانبے لانبے بال، جو ہزاروں حلقے بناتے ہوئے ابھی ہوئی حالت میں بھی کمر کو عبور کرتے تھے۔ اس کے وہ رخسار جن کو دنیا نے ہمیشہ شعلہ بلورین سمجھا۔ اس کا وہ شباب جس کے اندر کائنات کے تمام سمندروں کا شدید ترین طوفان اندر ہی اندر جوش کھاتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ الغرض رادھا اپنی ان تمام خصوصیات جمال کے ساتھ جنہیں فطرت مشکل ہی سے کبھی کسی ایک ہستی میں جمع کر دیتی ہے، اسوقت غایت درجہ مضمحل اور سوگوار تھی۔ لیکن باوجود اس کے اس کی آنکھوں کا، ان آنکھوں کا جن کی کیفیات کو دنیا کا کوئی لٹریچر قلمبند نہیں کر سکتا، یہ عالم تھا کہ بجائے نگاہوں کے ان سے کہر بانی خطوط نکلنے ہوئے نظر آتے تھے اور ان کی لمعانیت "تماشا سوز" حد تک بڑھ گئی تھی۔

(۵)

دیل میں آج ماتم بپا ہے، ہر طرف خزن و ملال کے آثار نمودار ہیں اور ہر شخص متیاب و مضطرب ہے۔ دوکانیں بند ہیں، بازار کی چل چل موقوف ہے اور لوگ پریشان ہیں کہ انہیں اب ایسا حکمراں

کیونکر نصیب ہو گا۔ دنیا میں کون ایسا ہے، جو اُن کے ساتھ اس رواداری کو جائز رکھے گا۔
ایسا فرمانروا جس نے باوجود اجنبی ہونے کے کبھی ہماری پرستشوں سے تعرض نہیں کیا، جو ہماری
ناقوس کی آوازوں سے کبھی حبس سجیں نہ ہوا، جس نے ہمارے حقوق کبھی پامال نہیں کئے،
جس نے ایک معمولی جزیہ کے عوض میں ہمارے جان و مال کی پوری حفاظت کی اور جو ہمیشہ
ہمارے نزاعات کو ہمارے ہی مذہب کے مطابق فیصلہ کرتا رہا، اب دوبارہ نہیں آ سکتا،
فطرت اس راحت رسانی کی تکرار مشکل سے کرتی ہے۔

سندھ کے عامل کو گئے ہوئے مہینوں ہو گئے، اور اس کی عزت و عظمت کی یاد آخر کار
اس صورت سے پرستار نہ بن سکی۔ یہاں تک کہ برہمنوں نے اس کا بت تیار کیا، تاکہ روز
صبح کو اس کے سامنے سیر اعتراف جھکا کر اس کی روحانی برکات حاصل کر سکیں۔
رات کا سکون عالم کو محیط ہے، چاند ویل کی خواب آلود آبادی پر اپنی شعاعیں ڈالتا ہوا
گذر رہا ہے اور رادھا بھی آہستہ آہستہ سپید چادر اوڑھے ہوئے اک نورانی سایہ کی طرح اپنے
جھونپڑے سے نکلتی ہے اور معبدِ عظیم میں داخل ہو جاتی ہے۔

(۶)

”اے میری روح پر ظلم کر نہ والے کافرانسان، اے میرے بدن میں محبت کی آگ بھونک دینے والے
ظالم دیوتا، کیا خدا کی اس وسیع آبادی میں تیرے سوا اور کوئی نہ تھا، جس کی آرزو سے میں اپنے دل
کو آباد کر سکتی۔ جس کی صورت میرے دماغ میں منقوش ہو جاتی۔

میں، کہ جس کے سامنے اگر صبح کا دیوتا بھی اپنی تمام نرم و خنک روشنیوں کے ساتھ آکر صرف ایک
نگاہِ لطف کا امیدوار ہوتا، تو کبھی کامیاب نہ ہو سکتا، میں، کہ جو شام کے دیوتا کو بھی صرف اس کی
رنگین ملاحقوں کی وجہ سے قابلِ توجہ نہ سمجھتی، میں، کہ جس کے روبرو قوس قزح کی رنگینیاں، چاند
کی سیم افشائیاں، پہولوں کی نگہت، بہار کی طلعت اور تمام وہ چیزیں جنہیں زمین و آسمان میں
حسین کہا جاسکتا ہے، کوئی کشش و جاذبیت نہ رکھتی تھیں، تیری صرف ایک نگاہِ حریف نہ بن
سکی، اور اپنے سارے وقار کو اس طرح تیرے اوپر قربان کر دیا، جس طرح وہ کوئی سب سے بُری
چیز ہو۔

دُنیا میں کیسے کیسے جوان، کیسے کیسے حسین موجود ہیں اور اس مندر کے اندر مجھے معلوم ہے کہ حبس میں بھول چڑھانے آیا کرتی تھی، تو سرزمینِ دیل کے کیسے کیسے نوجوان سورا، صرف اس انتظار میں گھنٹوں کھڑے رہا کرتے تھے، کہ شاید میں بھول کر ہی ان میں سے کسی کی طرف دیکھ لوں، لیکن اس مقدس جگہ کا ایک ایک ذرہ گواہ ہے، کہ میری نگاہ کبھی گھونگھڑٹ کے اندر بھی ہلکوں سے باہر نہیں نکلی، کیونکہ میں سمجھتی تھی کہ ان کو دیکھ لینا ان میں کسی آرزو کا پیدا کر دینا ہے، جسکا پورا کرنا میرے اختیار میں نہ تھا۔

لیکن تو دفعۃً نمودار ہوا اور تو نے مجھے، صرف ایک نظر سے اس طرح بے دست و پا کر دیا، جیسے مکند سے ہرن۔ میں نے اسی وقت چاہا کہ تو کوئی گستاخی کرے، میری جانب دستِ حرص و راز کرے اور میں تیرے اخلاق کی طرف سے متنفّر ہو کر تجھ سے بیزار ہو جاؤں اور اس طرح تیرے خیال کو دل سے نکال سکوں، لیکن مجھ پر کیسا شدید ظلم کیا، تیرے شریفانہ اخلاق نے کہ مندر میں مجھے لرزہ بر اندام دیکھتے ہی، تو نے اک نگاہ ”محبت فروز“ تو ضرور ڈالی، لیکن اسکے بعد اگر تو نے مجھ سے بات بھی کی تو اس طرح، گویا تو مجھے شرافت و عزت کی دیوی سمجھتا ہے اور تجھ میں نگاہ اٹھا کر بات کرنے کی بھی جرأت نہیں ہے۔ تو فاتح تھا تو اس وقت مالک تھا

اور اگر تو چاہتا تو دیل کی چرسین لڑکی تیری خدمت کے لئے حاضر ہو سکتی تھی، چہ جائیکہ مجھ ایسی غریب و بے کس لڑکی، کہ اگر تو اس وقت مجھے ذبح ہی کر دیتا تو کوئی تجھ سے میرے قصور کا پوچھنے والا نہ تھا، لیکن تو نے باوجود اسکے، کہ عنفوانِ شباب کے تمام جذبات تکمیل کے ساتھ تیرے ہر عضو سے ٹپک رہے تھے، مجھ سے، جو شاید بجا طور سے اپنے حسن و شباب پر ناز کر سکتی تھی، کوئی حیا سوز التفات نہیں کیا۔ پھر اسوقت سے کہ تو نے مجھے حفاظت کے ساتھ میرے گھر تک پہنچا دیا، اس وقت تک کہ میں تیری حسین تصویر، تیری مقدس مورت کے سامنے سرسجود ہوں، تو نے میری تلاش نہیں کی، حالانکہ مجھے تیری ہی بقیراری کا حال معلوم تھا، تو نے مجھے کبھی بے حجاب دیکھنا ہی گوارا نہیں کیا، حالانکہ میں جانتی ہوں تو اس کے لئے کیا کیا تڑپا کیا۔ صرف اسلئے کہ تو نے میری عزت کے مقابلہ میں اپنی تمناؤں کا خون کر دینا آسان سمجھا اور تو نے یہ کبھی گوارا نہیں کیا کہ لوگ را دھا کو بری طرح یاد کریں۔

میں ایک عمر تک پتھر کی ان مورتوں کے سامنے پیشانی گہستی رہی، لیکن حدود انسانیت سے ایک قدم بھی آگے نہیں رکھ سکی۔ تو نے صرف ایک بار اپنا چہرہ دکھایا اور میں اس مقام تک پہنچ گئی، جہاں کسی دیوی کی ہی رسائی نہیں۔

پہراب، جب کہ تو یہاں نہیں ہے اور شاید کہی نہ آئیگا، میں سوائے اسکے اور کیا کر سکتی ہوں کہ جب تک زندہ رہوں صرف تیری ہی پرستش کروں اور اک نئے مذہب کی بنیاد ڈال دوں جو دنیا والوں کو صرف پرستش اخلاق و شرافت کی تعلیم دے۔ تیرے لئے میری زندگی کے تمام آنسو صرف ہو چکے، میرے بدن کا ایک ایک بال تیرے لئے روچکا، یعنی پرستش کی اس معمولی منزل سے، جس سے ہر شخص واقف ہے، میں گذر چکی۔ پہراب میں تجھے صرف روح ہو کر بوجہ چاہتی ہوں کیونکہ تیرے احسان سے عہدہ برآ ہوئے اور تجھ سے مل رہنے کی تمنا اب شاید اسی طرح پوری ہو سکتی ہے۔“

(۷)

صبح ہوتے ہی سارے دیہل کو معلوم ہو جاتا ہے کہ راوہا، جس نے مہینوں سے مندر کا آنا جانا ترک کر دیا تھا، رات پو جانے کے لئے آئی اور مر گئی۔ لوگ متحیر تھے اور ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ کیونکر ہوا، مگر روشنی کے سامنے محمد قاسم کی وہ تصویر، جو اس سے قبل مضحک نظر آیا کرتی تھی، مسرت رہی اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ اسکے اندر کوئی روح دوڑ گئی ہے۔

نیاز

فطرت کے مشرف ہونیکا اس سے زیادہ کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ اس نے ہر عورت کو علیحدہ علیحدہ زبان دی ہے۔

ل۔ احمد

۱ (ماخوذ)

دو صنّاع

ندی کے کنائے، جہاں وہ لڑکی رہتی تھی، جمالی بساطِ نقاشی بیکر اس منظر کی تصویر بنانے روز آیا کرتا، اسکا موقلم سبز، سنہری اور لاجوردی فطرتِ خواہدہ کو بیدار کرے کیے نئے بیتاب تھا۔ لیکن روز وہ حسرت آمیز سانسیں لیتا ہوا گھر لوٹ جاتا۔ جس حسن کو اسکا قلم نقش نہیں کر سکتا تھا وہ اس کی آنکھوں میں کھنچ کر آ جاتا تھا۔ وہ حیران تھا کہ اسکی طبیعت کام کرنے پر آمادہ کیوں نہیں ہوتی؟ منظر کو نقش کرنے کیلئے جو خیال اسنے قائم کیا ہے اسے اپنے ذہن سے کاغذ پر منتقل کرنے سے وہ کیوں مجبور ہے؟

مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ جو غنائی مضحکہ کی تصویر بنی ہوئی، درختوں کی آڑ میں چھپ کر اسے دیکھتی رہتی ہے۔ اپنے گہریت کی عدم تکمیل پر جسے وہ اُسی کو سنانے کیلئے مرتب کرنا چاہتی ہے اس سے زیادہ حیران و متفکر ہے!

ل۔ احمد

غزل

خون ناحق کا گلہ تھا کچھ ادب کا جوش تھا
نور برق معرفت بخشا دل آگاہ نے
ہائے کیا دن ہیں کہ نقش سجدہ ہے اور نہیں
دلکی ہر کروٹ میں اک دنیا بنی اک مٹ گئی
سرگزشت عمر کہنے اس کو یار و داد عشق
عشق کی دنیا زمین سے آسمان تک شوق تھی

کیا یہ فانی کر رہا تھا عالم ہستی کی سیر
آگے آگے بخود ہی تھی پیچھے پیچھے ہوش تھا

فانی (بی۔ اے)

حکومت اسلام اور سنسکرت

(از نیاز فتحپوری)

عام طور سے خیال کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں میں پہلا وہ شخص جس نے سنسکرت حاصل کی، فیضی تھا، لیکن یہ درست نہیں۔ اکبر نے جس فیاضی اور دیادلی کے ساتھ، علوم و فنون کی قدر کی اور جس بے تعصبی کے ساتھ، اپنے ہندو رعایا کے جذبات کی رعایت ملحوظ رکھی، اسکا اقتضاء یہ نہیں تھا کہ صرف فیضی ہی سنسکرت کی طرف توجہ کرتا۔

یہ واقعہ ہے کہ دربار اکبری میں متعدد نفوس ایسے تھے، جو سنسکرت کے عالم خیال کئے جاتے تھے، اس لئے اولیت کا فخر فیضی کیلئے مخصوص کر دینا حسن ظن سے زیادہ کوئی درجہ نہیں رکھتا۔ ان لوگوں کی فہرست میں، جنہوں نے عہد اکبری میں، سنسکرت کی کتابوں کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا، علاوہ فیضی کے، عبدالقادر، نقیب خاں، ملا شاہ محمد، سلطان حاجی، حاجی ابراہیم وغیرہ کا بھی نام نظر آتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ جہاں کہیں اس نوع کے ترجمہ کا ذکر آیا ہے، وہاں مورخین نے ہی لکھا ہے کہ ”ہندی سے ترجمہ کیا گیا“ لیکن ادنیٰ غور سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ہندی سے مراد، انکی سنسکرت تھی۔

ملا نظام الدین احمد نے طبقات اکبری میں لکھا ہے کہ عبدالقادر نے متعدد کتابوں کا ترجمہ ہندی سے فارسی میں کیا، لیکن اسی کے ساتھ یہ امر بھی محقق ہے کہ انہوں نے رامائن اور سنگھارین بتسی کا ترجمہ کیا تھا اور اسلئے اظہار گمان ہی ہو سکتا ہے کہ وہ اصل سنسکرت زبان میں ہی ہوئی۔ عبدالقادر اور فرشتہ نے لکھا ہے کہ مہا بھارت کا ترجمہ بھی ہندی سے فارسی میں کیا گیا تھا۔ بدایونی کا بیان ہے کہ کچھ ترجمہ انہوں نے کیا اور کچھ نقیب خاں نے۔ فرشتہ، فیضی کی طرف منسوب کرتا ہے (سیر المتاخرین میں مہا بھارت کے ترجمہ کو بدایونی سے منسوب کیا ہے) یہاں بھی قیاس ہی چاہتا ہے کہ اصل سنسکرت زبان سے ترجمہ ہوا ہوگا۔

دوسری جگہ بدایونی نے لکھا ہے کہ بادشاہ نے اسے طلب کر کے اٹھروید کے ترجمہ کرنیکا حکم دیا۔ لیکن چونکہ یہ کام بہت مشکل تھا اس لئے ملا عبدالقادر نے غدر پیش کیا۔ اور ابراہیم سرہندی اس خدمت کے لئے منتخب ہوئے۔

اس بیان سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ترجمہ اصل سنسکرت زبان سے کیا جاتا تھا ورنہ اسقدر اشکال پیش آنے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ علاوہ اس کے حضرت امیر خسرو نے غشیقہ اور مثنوی نہ سپہر میں صاف طور سے ظاہر کر دیا ہے کہ ہندی سے مراد سنسکرت زبان تھی جس میں خود انہیں بھی کافی دستگاہ حاصل تھی۔

یہ ذکر تو عہد اکبری کا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مسلمان اس سے بہت قبل سنسکرت سے آشنا ہو چکا تھا اور اس زبان کی طرف انہیں بہت پہلے سے توجہ تھی۔

عہد باتوں الرشید میں، جو علمی نقطہ نظر سے مسلمانوں کے انتہائے عروج کا زمانہ خیال کیا جاتا ہے، جبر و مقابلہ میں محمد بن موتی کا رسالہ اور فن طلب پر متعدد رسائل سنسکرت سے عربی میں ترجمہ کئے گئے تھے۔ اگر زیادہ غور و تامل سے کام لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس سے بھی قبل ترک اور سنسکرت کا ترجمہ عربی میں ہو چکا تھا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عربوں میں ہندوستانی طلب کی طرف بہت پہلے سے خیال تھا۔

علاوہ اسکے ابتدائے عہد خلافت میں نجوم، موسیقی، ہیئت، علم التعمیر، علم الاصلنام، مذہب، زراعت، سمیات، قیافہ، فراست الید وغیرہ کے بہت سے رسائل سنسکرت زبان سے عربی میں منتقل ہو چکے تھے۔

اگر مخصوص طور سے ہندوستان ہی کی تاریخ کو پیش نظر رکھا جائے تو معلوم ہو سکتا ہے کہ ابھی مسلمانوں کے قدم ابھی طرح جمے ہی نہ تھے، کہ انہیں یہاں کے علوم و فنون حاصل کرنے کی طرف توجہ ہوئی۔ چنانچہ ابوریحان بیرونی کے حالات سے دنیا واقف ہے کہ اس نے ہندوستان کی زبان اور یہاں کے علوم کو اس قدر محنت کے ساتھ حاصل کیا تھا کہ وہ نہایت قلیل زمانہ میں سنسکرت کی نہایت دقیق کتابوں کا ترجمہ عربی، فارسی، میں، اور عربی، فارسی کتابوں کا ترجمہ سنسکرت میں نہایت آسانی سے کرنے لگا۔ محمد بن اسماعیل التوخی نے ہندوستان کا سفر ہی

صرف اسلئے کیا تھا کہ وہ یہاں کے علم نجوم کو حاصل کرے۔

جب فیروز شاہ تعلق کو تسخیر کر کوٹ گئے سلسلہ میں سنسکرت کی کتابوں کا بڑا ذخیرہ ہاتھ آیا تو اس نے حکمدار کے فلسفہ پیشینگوئی اور شکون کی کتابوں کا ترجمہ فارسی میں کیا جائے چنانچہ غزالدین خالد خانی نے اسکی تعمیل کی اور اس مجموعہ کا نام دلائل فیروز شاہی رکھا۔ اسی کے بعد اس نے ہندو کی ایک کتاب سنسکرت سے فارسی زبان میں منتقل کی۔ ایک کتاب اور فن بیطرہ سنسکرت سے فارسی میں منتقل کی گئی جس کے دیباچہ میں مترجم نے لکھا ہے کہ یہ کتاب غیاث الدین محمد شاہ خلجی کے حکم سے ۷۳۵ھ میں ترجمہ کی گئی۔ بغداد میں اس سے قبل ایک کتاب اسی فن سنسکرت سے ترجمہ ہو چکی تھی، جس کا نام کتاب البیطرہ تھا۔

صاحب مجمل التواریخ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اسے ہندوؤں کے قدیم فلسفہ کی کتاب کا ترجمہ فارسی میں دیکھا جو ۷۴۱ھ میں کسی دکنی سردار کے حکم سے ابوالحسن علی بن محمد بجلی نے کیا تھا۔ ان تمام واقعات سے یہ حقیقت واضح ہے کہ اس باب میں مسلمانوں کے اندر اولیت کا فخر فیضی کو حاصل نہیں ہے۔ بلکہ اس سے بہت قبل قرون اولیٰ میں عربوں کو اس طرف توجہ ہو گئی تھی۔

نیاز

غزل

قائم رہے کہیں، خلش انتظارِ دوست
یہ تو نے کیا کیا نگرہ بقرارِ دوست
اُن سے فریب وعدہ ناستوارِ دوست
اچھا مرا سلام لے، یادِ دیارِ دوست
واں، ہر نگہ کرشمہ بے اختیارِ دوست
خلوت میں بھی وہی ہے فریبِ قارِ دوست

ایسے کہاں نصیب کہ ہوں ہمکنارِ دوست
کچھ کچھ ہمارے دل کو سکون ہو چلا تھا پھر
سب شکوے، دِلکے شکوے، بس اک جواب میں
غربت کے دن ہی کٹ ہی گئی، خیرِ شکر ہے
یاں ہر خلش، جنوں کدہ اضطرابِ دل
اے واے صد ہزار تمنائے مضطرب

گو تم نے لاکھ کام لیا ضبط سے نیاز
پہچان ہی گئی نگہ ہوشیارِ دوست

نیاز

معلومات

عہد حاضر کے آلاتِ ہلاکت بار

اس سے قبل جب امریکہ اور سپانیہ کے درمیان جنگ وقوع میں آئی تھی، اس وقت عہدِ حاضر کی علمی ترقی نے آلاتِ حرب کی طرف جس توجہ سے کام لیا تھا، وہ اس امر کا کافی ثبوت تھا کہ انسانیت و تمدن کو صدمہ پہونچانے کیلئے یہی مہذب انسان کوئی دقیقہ کو شش کا اٹھا نہ رکھے گا، لیکن اسکے بعد برطانیہ نے یوروپ کے ساتھ جنگ کر کے اسپراک اور مہر تو شین ثابت کر دی اور اس محاربہ عظیم نے اس حقیقت کو عین یقین کے درجہ تک پہونچا دیا۔

اس ایک صدی کے اندر جنگی جہازوں، توپوں، بندوقوں اور دیگر ذرائع و وسائلِ حرب میں جیسی ترقی کی گئی وہ دنیا کا نہایت حیرت انگیز واقعہ ہے۔ نہ اب وہ فنِ کشتی باقی رہا ہے نہ فنِ نیزہ بازی، نہ اب کہیں دستِ بدست لڑائی ہوتی ہے اور نہ شمشیر بازی کی نوبت پہونچتی ہے۔ رستم و اسفندیار کی داستانیں، خوابِ خیال نظر آتی ہیں اور دارا و سکندر کے افسانے صرف و اہمہ کی کرشمہ زائیاں۔

اب سے قبل ہی جنگ کے مناظر تو ہی خاک و آب تھے، لیکن پہلے اگر زمین پر در و در و قوتِ جسمانی و شجاعت کا مقابلہ ہوا کرتا تھا تو اب میلوں فاصلہ سے (اس حال میں کہ ایک دشمن دوسرے کو دیکھ ہی نہیں سکتا) ہلاکت شروع ہو جاتی ہے اور اگر پہلے سطحِ بحر پر معمولی کشتیوں میں بیٹھ کر ایک دوسرے کو پتھروں کی مدد سے غرق کر دینے کی کوشش کی جاتی تھی، تو اب اسکے لئے وہ وہ آلات استعمال کئے جاتے ہیں کہ انکا سمجھنا بھی ہمارے لئے ہفتیوں ان طے کرنے سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ اور اسکی وجہ یہ ہے کہ پہلے انسان، انسان سے جنگ کرتا تھا، انسانی قوت، انسانی سے برسرِ پیکار ہوتی تھی، اور اب بجلی، بجلی سے لڑتی ہے، علم، علم سے جنگ کرتا ہے اور نہیں کہا جاسکتا کہ اس محاربہ کی انتہا کیا ہوگی، جس کی ابتداء اسقدر ہولناک ہے۔

اس وقت جنگ میں ان مادوں سے بہت زیادہ کام لیا جاتا ہے جو نہایت قوت کے ساتھ پھٹتے ہیں اور کسی دوسری چیز کو زیادہ دور تک پھینک سکتے ہیں، چنانچہ اسی لئے گن کاٹن، نائٹرو گلیسرین، لڈائیٹ، کارڈائیٹ، ڈیڈم گولی اور غیر دُخانِی بارود کا استعمال کثرت سے کیا جاتا ہے۔

لڈائیٹ (Lyddite)

موجودہ زمانہ میں بہت سے مادے ایسے ہیں جو بڑے بڑے گولوں کو توپ سے باہر نکال کر میلوں دور تک آسانی سے پھینک دیتے ہیں اور انہیں میں سے ایک لڈائیٹ ہی ہے جو پیرک سے ترکیب دی ہوئی ایک چیز ہے جو نائٹروک ایسڈ اور کاربونک ایسڈ کے باہمی تعامل سے کام کرتی ہے۔

جس وقت یہ مادہ پھٹتا ہے تو نہایت ہی کڑخت اور بلند آواز پیدا ہوتی ہے، لڈائیٹ کے گولوں کے بالائی خول کے ہزاروں ٹکڑے ہو جاتے ہیں اور وہ جس چیز سے چھو جاتے ہیں اسے تباہ و برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔ اس کا استعمال تویر، چین و جاپان، اور سوڈان، کی لڑائیوں میں کیا گیا تھا۔ جب کچن نے مہدی سوڈانی کی ایک خانقاہ پر اس کا استعمال کیا تو ۱۲۰ آدمیوں میں سے ۱۰۸ آدمی صرف ایک گولہ کے صدمہ سے ہلاک ہو گئے تھے۔

جاپان نے جب اپنے بادبانی جہاز سے ۱۲ انچ کا ایک گولا اس مادہ کا بنا ہوا پھینکا تو چین کی ایک بڑی توپ اپنے مرکب سے اتر گئی، ایک بڑے ذخیرہ میں آگ لگ گئی، دو توپیں بیکار ہو گئیں اور ۹۰ آدمی ایک ہی وقت میں ہلاک ہو گئے۔

غیر دُخانِی بارود (Smokeless Powder)

اس کو غیر دُخانِی اس لئے کہتے ہیں کہ اس سے اشتعال کے وقت دھواں نہیں پیدا ہوتا، بلکہ اک ہلکا سا قہقہی رنگ کا بخار نمودار ہوتا ہے جو نظر ہی نہیں آتا۔ یہ بارود منجھد صورت میں اسی کیطاعت بنائی جاتی ہے اور پھر اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کاٹ لئے جاتے ہیں۔ چونکہ یہ نہایت سریع الاشتعال

چیز ہے اس لئے بخیاں احتیاط اس کے چاروں طرف باریک پسر ہوئے سیسے کی تہ چڑھا دی جاتی ہے تاکہ ادھر سے اُدھر منتقل کرنے میں رگڑ نہ لگے۔

یہ بارود نہایت قوی ہوتی ہے اور چونکہ اس سے دھواں نہیں پیدا ہوتا، اسلئے میدان جنگ اور دشمن کا محاذ نگاہوں سے پوشیدہ نہیں ہوتا۔ اس کی قوت مدافعت بھی نہایت زبردست ہے۔

نائٹرو گلیسرین (Nitroglycerine)

عہد حاضر کے بہترین مدافع (Defence) مادوں میں سے ایک یہ بھی ہے۔ نہایت ہولناک چیز ہے اور اکثر اس کا استعمال پہاڑوں وغیرہ کے اڑانے میں کیا جاتا ہے۔ اسکا رنگ ہلکا زرد ہوتا ہے اور مزائیسیریں اس کے بنانے کی ترکیب یہ ہے کہ ایک بڑے حوض میں نائٹک ایسڈ اور سلفیورک ایسڈ برابر مقدار میں ڈالے جاتے ہیں اور مشین کے ذریعہ سے جلدی جلدی ان میں حرکت پیدا کرتے رہتے ہیں جب ان دونوں کی مقدار ۲۵ پونڈ ہو جاتی ہے تو ۱۵ پونڈ گلیسرین اس میں ڈال دی جاتی ہے۔ گلیسرین کے ملتے ہی اس مرکب کی حرارت فوراً بڑھنے لگتی ہے، یہاں تک کہ اگر نلوں کے ذریعہ سے اس حرارت کو دور نہ کیا جائے تو صرف ۹۰ درجہ حرارت میں سارا مرکب مشتعل ہو جائے۔ اسی لئے نائٹرو گلیسرین بنانے والے کی عمر زیادہ سے زیادہ پانچ سال ہوتی ہے۔ اس کے کارخانوں میں بڑی احتیاط کی جاتی ہے۔ کام کرنے والوں کو روزانہ کئی مرتبہ اپنا لباس تبدیل کرنا پڑتا ہے تاکہ خاک آلود لباس سے اڑا کر کچھ ذرات مادہ میں نہ بچائیں

ڈنڈم گولیاں (Dumdum bullets)

جنگ میں دو قسم کی گولیاں استعمال کی جاتی ہیں، ایک تو وہ چکنی گولیاں جو معمولی بندوقوں سے سیر کی جاتی ہیں اور جن سے مقصود ہلاک کرنا نہیں ہوتا، بلکہ دشمن کو بیکار کر دینا مد نظر ہوتا ہے، دوسری ڈنڈم قسم کی گولیاں ہیں جو نہایت خطرناک ہیں۔ ان گولیوں کا اندرونی حصہ نرم سیسے کا ہوتا ہے اور اوپر سخت نکل، یا تانبہ کا خول چڑھا رہتا ہے۔ جسوقت یہ گولی جسم پر لگتی ہے تو اوپر کا خول پھٹ کر پگھلا ہوا سیسہ بدن میں داخل ہو کر پھیل جاتا ہے اور چاروں طرف شدید زخم پیدا کر کے فوراً

ہلاکت کا باعث ہو جاتا ہے۔

بیس شل (Base Shell)

عہد حاضر کے مہلک ترین اسلحہ میں سے ایک بیس شل بھی ہے۔ یہ اک قسم کا گولہ ہے جو بڑی بڑی توپوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اسکا بیس یعنی زیرین حصہ، بالائی حصہ سے علیحدہ ہوتا ہے اور اس میں چار تیز چھریاں گولے کے چاروں طرف لپٹی رہتی ہیں جب گولا خونریزی کے لئے روانہ ہوتا ہے تو وہ دائرہ کی شکل میں گھومتا ہوا جاتا ہے اور اس کے بعد وہ چھریاں ۴۵ انچ قطر کا دائرہ بنائی ہوئی نکلتی ہیں اور جو سامنے آ جاتا ہے اسکے اندر تیرتی ہوئی گذر جاتی ہیں۔ جب اس قسم کا گولہ کسی صف بستہ فوج پر پھینکا جاتا ہے تو اس کے نتائج شدید ہلاک بار ہوتے ہیں۔

تارپیڈ اور سرنگ (Torpedoes, mines)

بحری جنگ میں تارپیڈ اور سرنگ بڑی خطرناک چیزیں ہیں۔ تارپیڈ و سگاری کی شکل کا ہوتا ہے اور اسکے منہ یا گلے سرے پر جو نکیلا ہوتا ہے گن کا ٹن ہوتی ہے۔ تارپیڈ و اوپر کھلی کے ذریعہ سے پھینکا جاتا ہے جو نہایت تیزی کے ساتھ بغیر کوئی آواز پیدا کئے ہوئے دشمن کی طرف سفر کرتا ہے۔ جب یہ جہاز سے ٹکراتا ہے تو فوراً پھٹ جاتا ہے اور اپنے چاروں طرف ہر چیز کو تباہ کر دیتا ہے۔ اسی طرح سرنگوں کا سلسلہ ہی نہایت ہولناک ہے۔ بڑے بڑے بندرگاہوں میں یہ سرنگ ہر وقت پڑی رہتی ہیں اور ان کا تعلق ساحل سے ہوتا ہے۔ یہ بھی کھلی کے ذریعہ سے پھینکی جاتی ہیں اور ایک شخص کے اختیار میں ہوتا ہے کہ جب اور عینی دورہ مناسب سمجھے تو کام میں لگے۔ بعض سرنگیں سطح آب پر بھی تیرتی رہتی ہیں اور جہاز ان سے چھو جانے کے ساتھ ہی پارہ پارہ ہو جاتی ہے۔

سرنگوں کا چلانے والا دور ساحل پر دور میں کے ذریعہ سے دیکھا جاتا ہے اور جب وہ معلوم کر لیا ہے کہ دشمن کا جہاز موقع پر آگیا ہے تو وہیں بیٹھے بیٹھے برقی بیٹن دبا دیتا ہے اور اوپر ہر سیلوں دور سرنگ پھٹ جاتی ہے اور جہاز کو ڈبو دیتی ہے۔

مشین گن

یہ چیز ہی نہایت خوفناک ہے اور اسکا استعمال میدان جنگ میں بھی ہوتا ہے اور سطح بحر پر بھی۔ اس کی ایک قسم گنٹلنگ ہے اس میں کئی نالیں جڑی رہتی ہیں اور دُور سے ایک بڑی توپ کی طرح نظر آتی ہے۔ عام طور سے دس نالیں جوڑی جاتی ہیں جو ایک مرکز پر گردش کرتی رہتی ہیں ایک نال جب اپنے ٹھیک مقام پر آتی ہے تو اس میں کار توپ داخل ہو کر فیر ہو جاتا ہے، اس کے بعد دوسری نال آجاتی ہے۔ اور اسی طرح نہایت تیزی سے یہ نالیں گردش کرتی رہتی ہیں اور ایک منٹ میں ۲۰۰ فیر ہو جاتے ہیں۔ دوسری قسم میکسم کہلاتی ہے۔ اس میں کار توپوں کی نہایت لمبی پٹی کا ایک سر الگ دیا جاتا ہے اور چلانے والے کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ صرف ایک بار گھوڑے کی لمبی دبا دے، اسکے بعد پھر اپنے آپ کار توپ آتے جاتے ہیں اور فیر ہوتا جاتا ہے، ۴۰۰ کار توپوں کی پٹی ایک منٹ کے اندر ختم ہو جاتی ہے۔

آہن پوش جہاز

بحری جنگ کے سلسلہ میں سب سے زیادہ کوشش اس بات پر صرف کی جا رہی ہے کہ جہاز پر گولہ اثر نہ کرے اور اسکے لئے لوہے کی نہایت مضبوط مضبوط چادریں جہاز کے اوپر چڑھائی جاتی ہیں۔ امریکہ کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اسنے بہترین آہنی چادریں طیار کی ہیں جو ڈوفٹ موٹی ہوتی ہیں اور انہیں معمولی گولہ اثر نہیں کر سکتا۔

سوچو جہلم میں اسکا بہت بڑا کارخانہ قائم ہے جہاں ہزاروں ٹن لوہا روزانہ گلا گلا کر یہ چادریں تیار کی جاتی ہیں۔ لوہے کے لئے بڑی بڑی بھٹیاں طیار کی گئی ہیں، جنہیں جدید اصول کے لحاظ سے کوئلہ مشتعل کیا جاتا ہے اور ان کی حرارت پختہ نالیوں کے ذریعہ سے لوہے کے اس انبار تک پہنچائی جاتی ہے جو پگھلنے کیلئے ایک جگہ ڈھیر ہوتا ہے۔ چونکہ لوہے کو گلانے کیلئے ۲۰۰۰ درجہ حرارت کی ضرورت ہے اور اسقدر حرارت کا دفعہ پیدا ہونا مشکل ہی ہے اور خطرناک بھی، اس لئے ترکیب یہ کی گئی ہے کہ جب کوئلہ کی حرارت لوہے تک پہنچتی ہے تو اسوقت تازہ آکسیجن

بھی پھونچا دیا جاتا ہے، جس سے لوہے کے ٹکڑے خود ایندھن کی طرح مشتعل ہو جاتے ہیں اور پگھل کر حوض میں جمع ہوتے جاتے ہیں۔

اسکے بعد یہ رفیق مادہ ڈھلائی کے کارخانہ میں جاتا ہے اور یہاں اسکی موٹی موٹی چادر میں ڈھالی جاتی ہیں۔ جنپیرسات ہزار ٹن کا دباؤ بھی اسلئے دیا جاتا ہے کہ وہ بے انتہا ٹھوس ہو جائیں۔ اسکے بعد وہ اور مختلف طریقوں سے دباؤ میں رکھی جاتی ہیں یہاں تک کہ وہ حد درجہ سخت ہو جاتی ہیں۔ اسکے بعد سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کے کاٹنے کا، اس کے لئے تقریباً تین تین گز کے آرے خاص ترکیب سے طیارے کئے گئے ہیں جو دو فٹ موٹی چادر کو نہایت آسانی سے کاٹ کر رکھ دیتے ہیں۔ ان تمام کارخانوں کی نگرانی ارباب حکومت کے سپرد ہوتی ہے، جو اپنے سامنے ان تمام مراحل کو طے کراتے ہیں۔

جب یہ چادر طیارہ ہو جاتی ہے تو پھر اسکا امتحان کیا جاتا ہے اور نہایت قریب سے اسپر بڑے بڑے گولے فیر کئے جاتے ہیں۔ اگر اس پر گولوں کا اثر نہیں ہوتا تو وہ جہاز سازی کے کارخانے میں بھیج دی جاتی ہے تاکہ جہاز کو آہن پوش کرنے کے کام میں لائی جائے، اور اگر گولے نے ذرا سا بھی خراش پیدا کر دیا تو چادر کی چادر سیکار کر دی جاتی ہے اور پھر گلا ڈالی جاتی ہے۔

نیا نر

یارانِ نجد

ماہرین علم الاخلاق کا نظریہ ہے کہ دنیا میں جب کوئی غلطی سرزد ہو جاتی ہے، تو پھر اس پھر کی لہروں کی طرح چاروں طرف کی فضا میں اک تموج پیدا ہو جاتا ہے اور سوسائٹی عرصہ تک پے درپے غلطیوں کا آماجگاہ بنی رہتی ہے۔

کاش میں مخمور صاحب کے چہرہ کو اس قدر شگفتہ نہ دیکھتا اور نگار کے دوسرے نمبر کی تعویق اشاعت کو اُنکے پاس اضمحلال سے منسوب کر کے، اس نظریہ کی اہمیت کا میں بھی قائل ہو جاتا! میں سن رہا تھا کہ ہمارے ایک محترم دوست، جو اپنی تمام خصوصیات "بیدلی" کے ساتھ، پنجاب سے باہر کہیں "معیقل جذبات" میں مصروف ہیں، لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب معلوم ہوا کہ آجکل وہ اگرچہ میں مدارج تصوف طے فرما رہے ہیں۔ میں اس خبر کو یقیناً لاہور کے ایک رسالہ کیلئے فال بد خیال کرتا، اگر اسی کے ساتھ یہ نہ معلوم ہو جاتا کہ غنائے خانہ ہمسایہ، حسن رہگزرے کے جواز پر وہ اب بھی مقصر ہیں۔

خوشا رعایت شوق!

نگار کا تیسرا نمبر کتاب کے پاس ہے، کتابت شروع ہو جاتی ہے اور منیجر نگار ہنوز تقاضہ فرما رہے ہیں کہ "رسالہ مرتب کر کے جلد ہی بدیہے ورنہ اشاعت میں دیر ہو جائے گی" قوتِ عمل کی یہی وہ منزل ہے، جہاں ہونچکر بیدل یہ کہنے پر مجبور ہو گیا:۔

کہ "تتاب اگر ہمہ خوں شود، نہ رہد بہ گرد و رنگ ما"

ہمارے وہ دوست جو ریس کے بہت شائق ہیں اور جن کے اس ذوق کا حال پہلی اشاعت میں درج کیا گیا تھا، وہ اس امر پر بہت خفا ہیں کہ میں نے صرف پانچ روپیہ کا نوٹ کیوں لکھا، حالانکہ انہیں سمجھنا چاہیے تھا کہ فلیتہ اسی کا خوب بنتا ہے۔

بعض کا خیال ہے کہ "یارانِ نجد" کے سلسلہ میں جو کچھ لکھا جاتا ہے وہ حقیقت ہوتی ہے، میں بھی اسکی تصدیق کرتا اگر اسوقت تک میں نے جنیب کے متعلق کچھ نہ لکھا ہوتا۔

نیاز

دیکر نظر ادا ہو گی

نفع
کریب نظر ادا ہو گی

صاحبان

سرکاری و ملٹری محکمہ جات گورنمنٹ اسکولوں و کالجوں و کلبوں و ریاستوں و ملٹیٹرمین
و دیگر بڑے بڑے مشہور سوداگروں کو اعلیٰ ترین سامان متعلقہ سیورٹس یعنی کرکٹ، ہاکی
فٹ بال، ٹینس، بیڈمنٹن، پولو وغیرہ بغیر وی۔ پی کے کھلے طور پر ارسال کیا جاتا ہے۔ او
قیمت بعد ازاں پسند آنے پر وصول کی جاتی ہے۔ نیز ہم یہ گارنٹی بھی کرتے ہیں۔ جو مال
پسند نہ آوے۔ وہ فوراً بغیر استعمال کئے واپس کر دیجئے گا۔ اور دام واپس لے لیجئے گا۔
اس صورت میں تمام اخراجات کرایہ آمد و رفت پیکنگ وغیرہ ہم اپنی گرہ سے دینگے
اس سے بڑھ کر آپ کی تسلی صرف مال کے خریدنے سے ہو سکتی ہے۔ آزمائش شرط ہے مکمل ہے مکمل
بالتصور فہرستیں مفت ارسال کی جاتی ہیں۔

المشہر

ای۔ کیپٹن۔ اینڈ کو۔ سیورٹس مینوفیکچررز۔ سیالکوٹ سٹی

تارکار پتہ:۔ سیالکوٹ سٹی۔

دائرہ سیاسیات مشرقیہ

یہ ایک الاشاعت ہے جو دہلی میں، اس غرض سے قائم کیا گیا ہے کہ بالعموم ایشیا اور مخصوص دنیا کے اسلام کے متعلق سیاسیات پر بہترین اور اعلیٰ معیار کا لٹریچر فراہم کرے مصنفین و مؤلفین سے درخواست کی کہ دائرہ سے خط و کتابت کریں۔
دائرہ ہر ایسی تصنیف تالیف کیلئے بہترین معاوضہ دینے پر تیار ہے کہ تین فیل شائع ہو چکی ہیں، ذیل کے پتہ سے طلب فرمائیں: سمرنا میں یونانی منظم قیمت ۵۰۰ روپے حواث سمرنا قیمت ۲۰۰ روپے

منجھ دائرہ سیاسیات مشرقیہ کو چھپڈت، دہلی

اعتماد قیمت پر ازراں سے

اسلئے ہنئے تہیہ کیا ہے کہ اس جنس گر انمایہ کو ازراں کر دیں، لہذا اگر آپ کو سامان چرمی مثلاً ٹانگ، سوٹ کیس، ہینڈ بیگ، ہوٹل ڈال، بوٹ اور شووز (زنانہ و مردانہ) اور ہیٹ وغیرہ درکار ہوں اور قابل اعتماد اور مناسب دامونہ پر حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اپنی ضروریات کیلئے ذیل کے پتہ پر خط و کتابت کیجئے۔ (مصور فہرست مرتب ہو رہی جو مفت حاضر خدمت کیجا ئیگی۔)
لطیف اینڈ کمپنی۔ منٹولہ اگرہ۔

دی سن مون شوکیٹری

ہر قسم کے بوٹ اور شووز زمانہ و مردانہ خالص اور بہترین چمڑے کے تیار کئے جاتے ہیں مضبوطی و خوبصورتی کی طرح ولایتی مال سے کم نہیں۔ علاوہ ازیں ہر کیٹری سے نسبتاً مال ازراں ملے گا۔ آپ کو صرف آرڈر دینے پر ہماری اس تحریر کی صداقت معلوم ہو جائیگی زیادہ لکھنا فضول ہے۔ (وہاب الدین ظفر الدین۔ لیدر منٹولہ ڈھولی کھار اگرہ)

عدم تعاون گورنمنٹ سے قطع تعلق

کے باوجود ہی کریمینٹ نہیں درہندوستان میں کارخانے نہ ہونیسے
کوں کی سازبیکار ہو جائیگے جسے ازراں در مضبوطا گھڑاں طلب کریں یلوئے گیوٹری
کارٹی و سال قیمت لکھ، امریکن لیور نہر نقشی ساختہ و تیرن کلاک کمپنی کارٹی
و سال قیمت سات روپیہ خلافت واج معدود شریف کارٹی سات سال
قیمت پانچ روپیہ سات واج خواجہ معتمد پانچ روپیہ کارٹی سات سال قیمت سات
روپیہ لیور جیلڈ کارٹی ۲۰ سال قیمت دس روپیہ اندھیر میں وقت دینے والی
تیرہ روپیہ۔

۱۔ ملشاکھن۔ بزم تجارت دہلی!

نیو برادرز کمپنی صدر بازار دہلی

حافظ امام الدین سلیٹر نگار نے باہتمام خواجہ صدیق حسین مطبع اگرہ اخبار میں چھپوا کر شائع کیا ہے